

خطباتِ اقبال میں قرآنی حوالے اور مباحث



مسعود احمد خان

DATA ENTERED

خطباتِ اقبال میں

قرآنی حوالے اور مباحث

مسعود احمد خان

اظہارِ نظر

2077/4
ح 2015

جملہ حقوق محفوظ
۱۲۲۵۶۱
۲۰۱۵ء

خطبات اقبال میں قرآنی حوالے اور مباحث : نام کتاب :

مصنف : مسعود احمد خان

ناشر : سید محمد علی انجم رضوی

اظہار سنز، ۱۹۔ اردو بازار، لاہور

فون : ۰۳۲-۳۷۲۳۰۱۵

سیل نمبر : ۰۳۰۰-۴۱۰۶۳۵۷

ای میل : izharsons_2004@hotmail.com

طابع : سید اظہار الحسن رضوی

مطبع : اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۲۵۰/- روپے

انتساب

اساتذہ کرام

حضرت مولانا محمد یوسف خان صاحب

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی صاحب

کے نام



فہرست

۹	خطبات اقبال پس منظر و پیش منظر	۱
۱۴	خطبات اقبال اور تشکیل جدید الہیات اسلامیہ	۲
۱۷	تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں قرآنی حوالے	۳
۲۳	خطبات اقبال میں تفسیر قرآن	۴
۲۶	خطبہ اول :	۵
	علم اور مذہبی مشاہدات	
۷۹	خطبہ دوم :	۶
	مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار	
۹۹	خطبہ سوم :	۷
	ذات الہیہ کا تصور اور حقیقت دعا	
۱۴۳	خطبہ چہارم :	۸
	خودی جبر و قدر، حیات بعد الموت	
۱۸۲	خطبہ پنجم :	۹
	اسلامی ثقافت کی روح	

۲۰۶

خطبہ ششم:

۱۰۰

الاجتهاد فی الاسلام

۲۱۵

خطبہ ہفتم:

۱۱

کیا مذہب کا امکان ہے؟



جسارت

علامہ اقبال پر بالعموم اور اس (خطبات) موضوع پر لکھنے کے لیے بالخصوص کئی لوازمات کی ضرورت ہے سب سے پہلی ضرورت تو اہلیت ہے، ان خطبات کو سمجھنے کے لیے جو کچھ درکار ہے اس کا تذکرہ سید نذیر نیازی صاحب اور ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے کیا ہے جو یہاں شامل ہے، سمجھنے کے بعد لکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ اہل علم کے کرنے کا کام ہے یا پھر یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کرنے والوں کا جن کے پاس لائبریریوں کی سہولت کے ساتھ مناسب راہ نمائی کے لیے اہل علم موجود ہوتے ہیں۔ کسی راہ نمائی یا مشاورت کے بغیر انسان اپنے محدود علم کے غرے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق و تنقید اور تحریر کے لیے مناسب ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے اپنا دامن ان تمام لوازمات سے خالی ہے۔ ایسے میں اپنی اس کوشش بل کہ حرکت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ کوشش کیا جواز رکھتی ہے؟ اس کا فائدہ؟ یا مقصد؟ سب سوالیہ نشان ہی رکھتے ہیں۔ فقط یہ بات ہے کہ ممکن ہے اہل علم کو اپنے کام اور تحقیق میں اس کوشش سے کوئی آسانی حاصل ہو جائے۔ اگر کسی ایک کو بھی یہ کوشش معمولی سی معاونت مہیا کر دے تو پھر اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے، یا حضرت علامہ کی ہمہ پہلو شخصیت کا کوئی ایک پہلو نمایاں ہو جائے تو بھی شاید اس کوشش کا کوئی جواز مل سکے۔ ورنہ یہ ایک جاہل کی جسارت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے لیے اہل علم اور بالخصوص ماہرین اقبالیات سے معذرت۔

ہمارے ہاں سنجیدہ علمی ماحول کا شدید فقدان ہے۔ حکومتی تعلیمی ادارے جہاں بہ کثرت سہولیات میسر ہوتی ہیں اساتذہ اور طلبہ کے اندر تعلیم و تعلم کا ماحول ہونا ضروری ہے لیکن بد قسمتی سے یہ ادارے سیاست کی آماجگاہ بن چکے ہیں۔ ارباب حکومت کہتے کچھ ہیں اور ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اسی لیے تعلیمی اداروں میں اہلیت کا شدید فقدان نظر آتا ہے، ان اداروں میں ایک مقدس پیشے سے منسلک لوگ اپنے پیشے کے منصب اور فرائض سے نا آشنا ہیں۔

اسی لیے ان اداروں کا ماحول نہایت تکلیف دہ ہے، علمی کام تو درکنار سرے سے تعلیمی سرگرمی ہی دشوار ہو رہی ہے۔ ایسے میں کوئی کیا اُمید رکھے کہ علم کی کوئی بات کوئی وزن رکھے گی۔ سو ایسے ماحول میں ماتم کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف معاشرہ بھی ایک بے لگام ہنگام اور افراتفری سے دوچار ہے، متانت، سنجیدگی، ٹھہراؤ، ادب آداب، تہذیب و شائستگی کا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ اس بگاڑ کے ماحول میں بننے کی کوئی بات جگہ ہی نہیں پاتی۔

اس سب کے باوجود ہماری قوم اور معاشرے سے مایوسی ہرگز روا نہیں آج بھی اہل علم و تحقیق خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہیں، کئی ایک ادارے معیاری تعلیم اور تحقیق میں مصروف ہیں۔ نئی نسل میں ماحول کی تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود مثبت خیالات موجود ہیں، بہتر تعلیمی اداروں سے جہاں سیاست کی آلودگی نہ ہوئی نسل کے نو نہالان کے جذبات اور کاوشوں کو دیکھ کر اُمید بندھتی ہے۔

اپنے اس کام میں جن بزرگوں اور احباب کی حوصلہ افزائی اور معاونت حاصل رہی اُن کا شکریہ واجب ہے۔ اپنے دو محترم اساتذہ کرام کا ذکر ہو چکا۔ اس کے بعد برادرِ نعمان احمد صدیقی ایسوسی ایٹ پروفیسر کی ہمدردانہ سرپرستی اور معاونت کا شکریہ، طباعت کے سلسلے میں اُن کا تعاون حاصل رہا۔ محترم محمد علی انجم صاحب جن کے ادارے نے کتاب کی طباعت کی اُن کا بے حد شکریہ، اُنہوں نے خود پروف ریڈنگ کی، آیات کا صرف ترجمہ دیا گیا تھا لیکن اُنہوں نے خود اصل متن کو شامل کرنے کا اہتمام کیا۔ تحریر کے دوران میں پوسٹ گریجویٹ کالج پلندری کے لائبریرین سردار محمد لطیف خان اور جناب سردار پرویز (عبداللہ صاحب) کے تعاون کا بھی شکریہ۔ کتاب کی تحریر کے دوران اپنے کچھ رفقا اور بالخصوص کچھ شاگردوں کی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کام کے لیے ہمیں لگاتی رہی اُن کا بھی بے حد شکریہ!

مسعود احمد خان

پلندری، سدھنوتی، آزاد کشمیر

۰۳۲۶-۵۱۵۳۲۰۷



خطباتِ اقبال، پس منظر و پیش منظر

جب عالمِ اسلام اور اسلامی تہذیب اپنے شانِ دار عروج کے بعد جمود کا شکار ہو کر زوال پذیر تھی تو یورپ میں احیائے علوم کی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا، اہل مغرب نے اسلامی تہذیب سے استفادہ کرتے ہوئے رومی اور یونانی علوم کو حیاتِ نو بخشی اور علمی تحقیق و ترقی کا آغاز کیا اور علمی ترقی کے ایک نئے دور کی ابتدا کی۔ سائنس کے میدان میں تحقیق و جستجو کی نئی بنیادیں اٹھائیں اور جدید مادی ترقی کی ابتدا کی۔

اس علمی تحریک کے آغاز سے قبل کا یورپ جہالت، غلامی، جمود کے ساتھ ساتھ مذہبی و سیاسی استبداد کا شکار تھا، بالخصوص مذہبی رہنماؤں نے اجارہ داری اور غلبہ حاصل کر رکھا تھا۔ مذہب استیصال اور استبداد کا ذریعہ بن گیا تھا۔ عیسوی مذہب نے انسان کو فطرتاً ہی قرار دے کر قابلِ نفرت بنا دیا تھا عیش پرستی عام ہو گئی تھی اور مذہب کے پردے میں ہوس پرستی عام تھی۔ عیسوی مذہب اپنے جمود کے باعث اس علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں مذہب کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اہل مغرب نے مذہب کو اپنی اجتماعی، قومی، معاشرتی اور سیاسی زندگی سے الگ کر لیا اور اسے انسان کی محض نجی زندگی تک محدود کر لیا۔ نئے نئے فلسفیانہ نظریات، مادیت پر مبنی طرزِ فکر اور مذہبی راہنماؤں کے خلاف ردِ عمل کے نتیجے میں مذہب ہی کو زندگی سے نکال دیا گیا۔

مذہب کے خلاف اس ردِ عمل کے تدارک کے لیے عیسوی مذہب میں اصلاح کی کوششیں بھی کی گئیں، پروٹسٹنٹ فرقہ انھی کوششوں کی پیداوار ہے لیکن بہ حیثیتِ مجموعی عیسوی مذہب انسان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی علمی، فکری اور ذہنی نشوونما کا ساتھ نہ دے سکا۔

”نشأۃ الثانیہ میں ذہنی و فکری نشوونما جس وسعت و فراخی کے ساتھ ہو رہی تھی اس کی مناسبت سے راہ نمائی کے لیے ایک زندہ و بلند پایہ مذہب کی ضرورت تھی جو فکری میدان میں زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہو اور جس کی تعلیمات، انفس، میں تبدیلی کے ساتھ فطرت اور کائنات کے سر بستہ رازوں کی تحقیقات سے دل چسپی ظاہر کرتی ہوں۔ اسی قسم کا مذہب موقع کی مناسبت سے فکر و عمل کے لیے بلند نصب العین عطا کر سکتا تھا اور یہی نشأۃ الثانیہ کے وسیع اور متنوع اجزا کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی ہمت کر سکتا تھا لیکن مروجہ عیسوی مذہب کی زندگی کش پالیسی اور صلیبی جنگوں سے پیدا شدہ رقابت کی وجہ سے نئی دنیا کو یہ مذہب میسر نہ آسکا۔“ (لا مذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ مولانا تقی امینی۔ نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۷ء۔ ص ۵۵۔)

دوسری طرف عقلیت اور مادیت کے پے در پے حملوں اور ان کے غلبے کی وجہ سے بھی عیسوی مذہب پسپائی کا شکار ہو گیا، رہی سہی کسر ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس جیسے فلسفیوں کے نظریات نے پوری کردی اور انسان اپنی روحانی اور حقیقی اساس سے ہی محروم ہوتا چلا گیا، یورپی اقوام کے سیاسی غلبے و استیلا کے باعث یہ نظریات ساری انسانیت پر مسلط ہو گئے۔ مذہبی اساس سے محرومی کے باعث یہ اقوام کسی اخلاقی ضابطے سے بھی محروم ہو گئیں اور یوں انسانیت کا استیصال عام ہو گیا، مغربی تہذیب نے انسان کو مختلف تعصبات میں مبتلا کر دیا، وطنیت، نسل پرستی، مادیت اور ان جیسے دیگر عوارض نے غلبہ حاصل کر لیا۔ زندگی کی وحدت ختم ہو گئی اور انسانیت مختلف خانوں میں بٹ گئی۔ حیات انسانی کے اس المیے کا ذکر کرتے ہوئے خطبات کے مترجم سید نذیر نیازی مقدمے میں لکھتے ہیں:

”زندگی کی وحدت تکلیف دہ اضداد میں بٹ گئی، جن کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اس لیے ہمارے سامنے ایک نہیں کئی راستے ہیں، یہ راستے کہیں نہیں ملتے، نہ یہ ممکن ہے کہ ایک خاص حد سے آگے بڑھ سکیں، ایک راستہ عقل و فکر کا ہے ایک ایمان و یقین کا، ایک علم و حکمت کا اور ایک تہذیب و تمدن کا، ان

تقاضوں کا جو حیات، فرد اور جماعت کی صورت گر ہیں لیکن جن کی نہ کوئی
مشترک اساس ہے نہ کوئی جامع اصول جو ان سب کو ایک منزل تک لے
جائے۔“ (تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ۔ سید نذیر نیازی۔ بزمِ اقبال،

لاہور ص ۲۲، ۲۳۔)

دوسری طرف جب یورپ علمی میدان میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا تو مسلمان زوال
کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ صدیاں جو یورپ میں علمی انقلاب ترقی اور عروج کی صدیاں تھیں ان
میں مسلمان زوال کی پستیوں میں گر کر انھی اقوام کی غلامی کا شکار ہو رہے تھے مسلمانوں میں علمی
ترقی اور تحقیق تو رک چکی تھی اس کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی مسلمان مسلسل انتشار اور
شکست و ریخت سے دوچار تھے۔ عثمانی سلطنت ایک شان دار عروج دیکھ کر منطقی انجام کی طرف
بڑھ رہی تھی، اس سے یورپ کے مقبوضات تو رہے ایک طرف عرب علاقے بھی چھن رہے
تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال اور علمی جمود قوت و سطوت کے خاتمے کی وجہ سے اسلام کی
شان دار تعلیمات بھی نشانے پر تھیں اور اسے بھی عیسائیت کی طرح ایک فرسودہ مذہب قرار دیا
جا رہا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب سرزمین ہند میں اقبال نے جنم لیا، جب اقبال نے شعور کی منزلیں
طے کیں اس وقت گویا مسلمانوں کا سیاسی، معاشرتی اور علمی زوال مکمل ہو چکا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ
جو مسلمانوں کی مرکزیت، قوت و سطوت اور سیاسی زندگی کی علامت تھی آخری سانس لے رہی
تھی، ہندوستان میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بحالی کے لیے آخری جنگ ۱۸۵۷ء
میں لڑ کر ہار چکے تھے دنیا میں کوئی خطہ زمین ایسا نہیں تھا جہاں اسلام کے نام لیواؤں کو عزت و
آبرو حاصل ہو۔ مغرب کی فکری یلغار کا جواب دینے کے لیے انھی کے ہتھیاروں سے لیس کوئی
بلند فکر راہ نما موجود نہ تھا۔ نئی صورت حال، نئے نظریات، بدلتی ہوئی دنیا اور اس کے مذہبی،
سیاسی، معاشی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق راہِ عمل کہیں سجھائی نہیں دیتی تھی۔ برصغیر کے
مسلمان اسلام سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے لیکن محض جذباتی وابستگی سے کوئی راہ عمل نہیں نکل

سکتی اور اس سے مسلمانوں کی رہی سہی قوت کے نقصان کا بھی اندیشہ تھا جیسا کہ تحریک خلافت اور تحریک ہجرت کا نتیجہ نکلا تھا۔

ایسی صورت حال میں ایک ایسے راہ نما کی ضرورت تھی جو مغرب کی فکری یلغار اور اس کے نقائص کو کما حقہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں بالخصوص برصغیر کی ملت اسلامیہ کے سامنے راہ عمل رکھتا۔ ان کی اخلاقی، قومی و ملی اور سیاسی راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دیتا۔ بلاشبہ یہ عظیم الشان فریضہ علامہ اقبال نے انجام دیا۔ علامہ ایک طرف مغرب کے جملہ نظام ہائے فلسفہ سے نہ صرف آگاہ تھے بل کہ ان کے نقائص سے بھی بہ خوبی واقف تھے اور دوسری طرف وہ اسلامی علوم بالخصوص قرآن پاک میں گہری بصیرت کے ساتھ ملت اسلامیہ کی حیات نو کے لیے درد مندانہ فکر رکھتے تھے بل کہ ان کی زندگی، شاعری و فلسفہ کا محور ہی ملت اسلامیہ کی حیات نو تھا۔ علامہ کے سامنے جہاں ملت اسلامیہ کی فکری راہ نمائی کا فریضہ تھا وہیں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے راہ عمل کا تعین بھی تھا کہ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر یہاں کے مسلمان اپنی قومی ہستی اور اپنے اجتماعی وجود کو باقی رکھ سکتے ہیں۔

اسلام سے محبت اور دین کی خدمت کا جذبہ حضرت علامہ کی تربیت کا حصہ تھا ان کے والدین نے ان کی تربیت ایک باعمل مسلمان کی حیثیت سے کی تھی۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے بقول ان کے والد نے ان کی تعلیم اور تربیت کا معاوضہ ہی خدمت اسلام کی صورت میں طلب کیا تھا (زندہ رود۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، جلد اول، ص ۶۵) علامہ اگرچہ ابتدائی دور میں مختلف نظریات سے متاثر رہے لیکن دین کی محبت اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جذبہ ابتدا ہی سے ان میں موجود رہا۔ اس کی مثالیں ان کی ابتدائی شاعری میں ملتی ہیں۔ البتہ چوں کہ یہ دوران کی فکر کا تشکیلی دور تھا اس لیے ابھی اس میں کچھ باتیں ان کے سامنے واضح نہیں تھیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے افکار نکھرتے چلے گئے بالخصوص یورپ میں تعلیم حاصل کرنے اور یورپی تمدن کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد انہوں نے کچھ چیزوں کو ترک کر دیا۔

یہ سارا دور علامہ کا تفکر اور غور و فکر کا دور ہے۔ مسلمان بہ حیثیت فرد اور مسلمان بہ حیثیت قوم اور پھر دونوں کے لیے زوال سے نکلنے اور احیائے اسلام کے لیے راہ عمل ان کی فکر کا محور ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑے گہرے فکر کے بعد مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی، معاشرتی، قومی اور سیاسی راہ نمائی کے لیے گویا ایک مکمل لائحہ عمل ترتیب دیا اور پھر اپنی شاعری، افکار، ذاتی، معاشرتی، سیاسی اور قومی زندگی کو اس کے لیے وقف کر دیا۔

علامہ کی مثال ایک سے شخص کی ہے جو ایک بلندی پر کھڑے ہو کر نیچے بھٹکنے والوں کو دیکھ رہا اور جس نے صحیح راہ بھی جان لی ہے اور اب وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں لگا کر لوگوں کی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے :

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

اقبال اُمت کی بھٹکتے ہوئے قافلے کو درست راستے کی طرف لے جانے کے لیے اپنا سب کچھ وقف کیے ہوئے ہے، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ جذبے کی طاقت سے لیس ہو کر قوت عمل حاصل کریں، انھوں نے عقلی و فکری راہ نمائی کے لیے خطبات پیش کیے کہ وہ کسی فکری بحران کا شکار نہ ہوں اور آئندہ قوم فکری بنیادوں سے محروم نہ رہے۔ سیاسی راہ نمائی کے لیے خود میدان سیاست میں اترے اور ایک نہایت نازک دور میں قوم کی راہ نمائی کی اور پہلے اپنے افکار کے نتائج حاصل کرنے کے لیے برصغیر کی ملت اسلامیہ کے لیے ایک الگ وطن کا تصور پیش کیا اور پھر اسے حاصل کرنے کے لیے ایک راہ نما بھی قائد اعظم کی صورت میں قوم کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ جس نے ان کی توقعات کے عین مطابق قوم کی کشتی کو پار لگا دیا۔

اس مرد درویش نے جذبہ عمل کے لیے شاعری کے ذریعے، فکری بنیادوں کے لیے اپنے فلسفیانہ افکار جو خطبات میں پیش کیے، کے ذریعے اور عملی صورت حاصل کرنے کے لیے اپنی مختصر سیاسی جدوجہد کے ذریعے ایک پراگندہ اور منتشر قوم کو ایک راستے پر لگا دیا۔ جو بالآخر اس قوم کو ایک مقام تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

خطباتِ اقبال اور تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ

علامہ اقبال کے انگریزی خطبات جو ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصے میں لکھے گئے اور مختلف مواقع پر پڑھے گئے، پہلی بار ۱۹۳۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ خطبات نہایت مشکل انگریزی میں لکھے گئے اس پر ان کا موضوع بھی ایسا ہے کہ عام آدمی تو کیا تعلیم یافتہ طبقے بل کہ فلسفہ دان حضرات کے لیے بھی سمجھنا مشکل تھا اور کم ہی لوگوں نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی، جیسا کہ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

”بہت کم، فلسفہ دان حضرات نے بھی تو جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، خطبات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ دراصل خطبات میں علامہ نے اساسی طور پر جو بحث اٹھائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مغربی فلسفہ اور علوم و معارف کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت پر پورا عبور حاصل ہو۔“ (مکتوباتِ اقبال - سید نذیر نیازی - اقبال اکیڈمی، کراچی - ۱۹۵۷ء - ص ۲۵)

اسی طرح ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں :

”تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ ایک مشکل کتاب ہے، کیوں کہ اس میں مشرق و مغرب کے ڈیڑھ سو سے زائد قدیم و جدید فلسفیوں، سائنس دانوں، عالموں اور فقیہوں کے اقوال و نظریات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اقبال قاری سے توقع رکھتے ہیں کہ خطبات کے مطالعہ سے پیش تر وہ ان شخصیات کے زمانے، ماحول اور افکار سے شناسا ہو۔ ان شخصیات میں بعض تو معروف

ہیں اور بعض غیر معروف۔ علاوہ اس کے خطبات کا اندازِ تحریر نہایت پیچیدہ ہے۔ بسا اوقات کسی مقام پر ایک ہی بحث میں کئی مسائل کو اٹھایا گیا ہے یا ایک مسئلہ پر جاری بحث کو اچانک چھوڑ کر کسی اور مسئلہ کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور اس پر اظہارِ خیال کی تکمیل کے بعد پھر سے چھوڑے ہوئے مسئلہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے“ (زندہ رود۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال۔ شیخ غلام علی

اینڈ سنز، لاہور۔ جلد سوم ص ۳۷۰۔)

جب ان انگریزی خطبات کی زبان اور موضوعات کی یہ کیفیت تھی تو ان کے اردو زبان میں منتقل ہونے سے کوئی خاص فرق پڑنے کا امکان نہیں تھا۔ تاہم اس کے باوجود خطبات کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کے ترجمے کے لیے سوچ بچار اور کوشش شروع ہو گئی۔ نذیر نیازی کے بقول وہی ان خطبات کے ترجمے کے محرک تھے :

”ایک روز یہی باتیں ہو رہی تھیں اور زور اس امر پر تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد ان کی ہر جدوجہد کی شرطِ اولین ہے۔ مسلمانوں سے اسلام، اسلام سے اس کے سیاسی، اجتماعی مقاصد اور سیاسی اجتماعی مقاصد سے بعض فلسفیانہ ما بعد الطبعی تصورات کا ذکر آ گیا، میں نے عرض کی خطبات کی اشاعت کب ہوگی، فرمایا انتظام ہو رہا ہے، میں نے پھر عرض کیا ان کا اردو ترجمہ کیسا رہے گا، ارشاد ہوا ہو جائے تو اچھا ہے، لیکن ترجمہ کرے گا کون؟ میں نے عابد صاحب کا نام لیا، فرمایا دہلی واپس جا رہے ہو، ان سے گفت گو کرو ان کا ترجمہ کام یاب رہے گا۔“ (مکتوبات اقبال۔ سید نذیر نیازی۔ ص ۲۱۔)

لیکن علامہ کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر سید عابد حسین ترجمہ کی ذمہ داری نہ لے سکے

تو پھر علامہ نے سید نذیر نیازی کو ہی ترجمہ کرنے کو کہا :

”انگریزی لیکچر قریباً ۱۵ اپریل کو تیار ہو جائیں گے، آپ اپنے دوست سے پوچھیے کہ آیا وہ اردو ترجمہ کرنے کے لیے لاہور آسکیں گے یا نہیں۔ اگر وہ نہ آسکیں تو آپ خود یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔“ (مکتوبات

اقبال۔ سید نذیر نیازی۔ ص ۲۲۔)

ایک دوسرے خط میں علامہ نے انھیں لاہور آکر آزمائشی طور پر ترجمہ کرنے کے لیے کہا تا کہ معلوم ہو سکے کہ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوگی:

” آپ کا خط مل گیا ہے ترجمے کا خیال بہ دستور ہے بل کہ بعض اصحاب کی طرف سے تقاضا ہے کہ جلد کیا جائے۔ گو مجھے اس پر شبہ ہے کہ عام لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ علما جنہوں نے فلسفہ خاص طور پر مطالعہ کیا ہے وہ میرا مقصد سمجھ سکیں گے۔ بہر حال جب آپ لاہور آئیں تو نمونہ کے طور پر کچھ حصہ ترجمہ کریں تا کہ معلوم ہو کہ کہاں تک اس کوشش میں کامیابی ہو سکے گی۔“ (مکتوبات اقبال۔ ص ۲۴۔)

چنانچہ سید نذیر نیازی نے علامہ ہی کی ہدایت پر ترجمہ شروع کیا۔ بعض اصطلاحات اور نکات کے حوالے سے علامہ نے خود ان کی راہ نمائی کی، اس کی تفصیل سید نذیر نیازی نے مکتوبات اور پھر ترجمے کے مقدمے میں دی ہے۔

سید نذیر نیازی نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے یہ ترجمہ کیا، بہ قول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

”یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا، چنانچہ نذیر نیازی کو ترجمے کی تکمیل میں کئی برس لگے۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے نام سے اس کی پہلی اشاعت ۱۹۵۸ء میں بزم اقبال، لاہور سے ہوئی۔ متعدد نامور نقادوں اور اقبال شناس علمائے اس ترجمے کو سراہا۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ مضمون، علامہ اقبال کے انگریزی خطبات۔ اقبالیات، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۷ء ص ۱۷۔)



تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ میں قرآنی حوالے

سینڈیر نیازی کی محنت اپنی جگہ لیکن اس ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا گیا۔ بالخصوص ابتدائی اشاعتوں میں ٹائپ اور حوالے بالخصوص قرآنی آیات کے حوالہ جات میں ذمہ داری نظر نہیں آتی ہمارے پیش نظر تشکیلِ جدید کا بزمِ اقبال کا طبع شدہ تیسرا ایڈیشن (۱۹۸۶) ہے اس سلسلے میں کچھ نکات سامنے آتے ہیں۔ تشکیلِ جدید میں قرآنی آیات کے حوالے تین طرح کے ہیں :

اول..... اصل انگریزی متن میں جن آیات کا حوالے کے ساتھ ترجمہ دیا گیا ہے تشکیلِ جدید میں ان آیات کو اصل عربی عبارت میں دیا گیا ہے تشکیلِ جدید کے متن میں شامل ان قرآنی آیات کا ترجمہ ساتھ نہیں دیا گیا، گویا فرض کر لیا گیا کہ اردو کے قارئین آیات سمجھ جائیں گے، اصل انگریزی خطبات میں ان آیات کا ترجمہ دیا گیا ہے اور حوالہ بھی موجود ہے تشکیلِ جدید میں حوالہ ساتھ ہی بریکٹ میں دے دیا گیا ہے۔

دوم..... انگریزی متن میں جہاں کہیں قرآن پاک کی کسی آیت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا، تشکیلِ جدید میں ایسی آیات کا حوالہ حاشیے میں دے دیا گیا ہے۔

سوم..... انگریزی متن میں آیت کا ذکر تو نہیں لیکن عبارت کا مفہوم کسی قرآنی آیت سے ملتا ہے، تو تشکیلِ جدید میں اس کا حوالہ بھی حاشیے میں دیا گیا ہے لیکن یہ حوالہ جات جامع نہیں ہیں یعنی جہاں کہیں مناسب سمجھا گیا کسی آیت کا حوالہ دے دیا گیا۔ جہاں ضروری نہیں سمجھا گیا اگر عبارت میں قرآنی آیت کا مفہوم تھا تو بھی حوالہ نہیں دیا گیا۔

خطبات اقبال کے ابتدائی انگریزی ایڈیشن کے بارے میں معلوم نہیں کہ ان میں قرآنی حوالہ جات کی ترتیب کیا تھی، آیا قرآنی آیات اصل عربی میں تھیں یا نہیں البتہ اب خطبات کے جو انگریزی ایڈیشن ملتے ہیں ان میں آیات اصل عربی میں نہیں ہیں۔ ماہرین اقبال کے نزدیک انگریزی خطبات کا سب سے مستند نسخہ شعبہ فلسفہ، گورنمنٹ کالج، لاہور کے سابق سربراہ ایم سعید شیخ کا مرتب کردہ ہے۔

ہمارے پیش نظر اس کا ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور کا طبع شدہ ایڈیشن (۲۰۱۱ء) ہے۔ اس ایڈیشن کے متن میں قرآنی آیات اصل عربی میں نہیں ہیں بل کہ ان کا ترجمہ دیا گیا ہے، اور ان کا حوالہ ساتھ ہی خطوط واحدانی میں دیا گیا ہے، حاشیے یا آگے notes&references میں ان آیات کا حوالہ نہیں۔ تشکیل جدید میں اصل آیات دی گئی ہیں۔ اور ان کے نمبر ساتھ ہی خطوط واحدانی میں دیئے گئے ہیں اصل انگریزی خطبات میں ترجمہ شدہ آیات اور تشکیل جدید کی اصل طبع شدہ آیات کے نمبروں میں فرق ہے۔ قرآن پاک سے موازنہ پر ایم سعید شیخ کے نمبر درست ہیں جب کہ تشکیل جدید کے نمبر درست نہیں ہیں ان نمبرات کی فہرست الگ دی گئی ہے۔ (تشکیل جدید کے نئے ایڈیشن ۲۰۱۲ میں ان میں سے بہت سے نمبرات کی درستی کی گئی ہے لیکن پھر بھی کچھ اغلاط باقی ہیں، درست کیے گئے نمبرات کے سامنے نشان دہی کر دی گئی ہے۔)

اغلاط نامہ

نمبر شمار	صفحہ نمبر تشکیل جدید (ایڈیشن ۸۶)	حوالہ آیت نمبر	درست نمبر	کیفیت
۱-	۱۵	۳۸-۳۳	۳۹، ۳۸-۳۳	
۲-	۱۶	۱۸۸-۳	۱۹۱-۱۹۰-۳	(۱۲ کے ایڈیشن میں ۳- ۱۸۸، ۱۹۰ ہے)

	۲۰-۲۹	۱۹-۲۹	۱۶	۳
	۲۰-۳۱	۱۹-۳۱	۱۶	۴
	۵۰۲-۹۵	۲-۹۵	۱۷	۵
	۱۹-۱۶-۸۴	۲۰-۱۷-۸۴	۱۸	۶
	۱۱-۱۳	۱۲-۱۳	۱۸	۷
	۳۱-۳۰-۲	۳۱-۲۸-۲	۱۹	۸
(۱۲ کے ایڈیشن میں ۶-۹۹ کیا گیا ہے)	۹۹-۹۷-۶	۹۸-۶	۲۰	۹
	۲۶-۲۵	۲۷-۲۵	۲۰	۱۰
	۲۰-۱۷-۸۸	۱۷-۸۸	۲۰	۱۱
	۹-۷-۳۲	۸-۶-۳۲	۲۳	۱۲
	۶۰-۴۰	۶۲-۴۰	۲۹	۱۳

خطبہ دوم

(۱۲ میں درست کیا گیا ہے)	۶۲-۲۵	۶۳-۲۵	۷۰	۱۴
	۲۹-۳۱	۲۸-۳۱	۷۱	۱۵
	۸۰-۲۳	۸۲-۲۳	۷۱	۱۶
(۱۲ میں درست کیا گیا ہے)	۵-۳۹	حوالہ درج ہی نہیں کیا	۷۱	۱۷
(۱۲ میں درست کیا گیا)	۵۰-۳۹-۵۴	۳۹-۵۴	۷۵	۱۸
	۵۹، ۵۸-۲۵	۶۰-۲۵	۷۵	۱۹
		۵۴-۱۹۵	۷۷	۲۰

یہ حوالہ ناقابل فہم ہے سابقہ تمام ترتیب میں پہلے سورت کا نمبر ہے اور پھر آیت کا نمبر۔ اس ترتیب سے سورت نمبر ۱۹۵ ہے جب کہ آیت نمبر ۵۴۔ جو عجیب ہے۔ اس حوالے کو ۲۰۱۲ء کے

ایڈیشن میں بھی درست نہیں کیا گیا اور وہی حوالہ ۱۹۵-۵۴ دوبارہ ویسے ہی لکھا گیا ہے۔ تاہم ایم سعید شیخ کے ایڈیشن میں اس کے تین آیات کے حوالے درج ہیں۔ سورہ الفرقان آیت نمبر ۲- سورہ القمر آیت نمبر ۱۴۹ اور سورہ الاعلیٰ آیت نمبر ۲، ۳۔

	۶۲-۲۵	۶۳-۱۵	۸۵	-۲۱
	۴۲-۵۳	۱۴-۵۳	۸۷	-۲۲
	۸۰-۲۳	۸۲-۲۳	۸۹	-۲۳

خطبہ سوم

	۴۱-۱۱۲	حوالہ نہیں دیا گیا	۹۵	-۲۴
	۲۶-۳	۲۵-۳	۱۲۱	-۲۵
	۱۱-۷	۱۰-۷	۱۲۶	-۲۶
	۱۰-۷	۹-۷	۱۲۶	-۲۷
(۱۲) میں درست کیا گیا ہے)	۱۱۹، ۱۱۸-۲۰	۱۱۸-۲۰	۱۲۷	-۲۸
	۳۵-۲۱	۳۶-۲۱	۱۲۹	-۲۹
	۵، ۴-۹۵	۴-۹۵	۱۲۹	-۳۰
(۱۲) میں درست کر دیا گیا)	۶۸، ۶۷-۲۲ ۶۹	تشکیل میں آیات بلا حوالہ نقل کی گئی ہیں	۱۳۹	-۳۱
(۱۲) میں درست کیا گیا ہے)	۱۱۵-۲	۵۲-۲	۱۴۰	-۳۲
(درست کیا گیا ہے)	۱۷۷-۲	۱۷۶-۲	۱۴۰	-۳۳
(اس سے آگے آیات کے نمبر ۱۲ کے ایڈیشن میں درست کیے گئے ہیں)	۱۳-۴۹	۱۳-۶۹	۱۴۱	-۳۴

خطبہ چہارم

	۱۶۵-۶	۱۶۵-۲	۱۴۳	-۳۵
	۸۵-۱۷	۸۷-۱۷	۱۵۲	-۳۶
	۳-۵۷	۲-۵۷	۱۶۱	-۳۷
	۱۹،۱۸-۸۲	۱۸-۸۲	۱۷۶	-۳۸
	۶۱،۵۸-۵۶	۶۱،۵۹-۵۶	۱۷۷	-۳۹
	۶۸-۳۹	۶۹-۳۹	۱۷۸	-۴۰
	۲۲-۵۰	۲۱-۵۰	۱۸۵	-۴۱
	۷،۶-۱۰۲	۶-۱۰۲	۱۸۵	-۴۲

خطبہ پنجم

	۲۵-۵۷	۱۲۵-۵۷	۱۹۱	-۴۳
	۱۴۰-۳	۱۳۹-۳	۱۹۶	-۴۴
	۱۳۷-۳	۱۳۶-۳	۲۱۲	-۴۵

یہاں قرآنی حوالوں اور مباحث کے ضمن میں اسی ترتیب کے مطابق ان آیات کا ترجمہ اور ساتھ ہی مختصر تفسیر بھی دی گئی ہے جو اصل متن کا حصہ ہیں، انگریزی میں ان کا ترجمہ ہے جب کہ تشکیلِ جدید میں ان آیات کو اصل عربی عبارت میں دیا گیا ہے، جو آیات اصل متن میں عربی عبارت کی صورت میں نہیں بل کہ تشکیلِ جدید کے حاشیے میں دی گئی ہیں یا ان کا حوالہ نمبر دیا گیا ہے ان کا بھی ترجمہ اور جہاں مناسب سمجھا گیا تفسیر دی گئی ہے۔

چوں کہ تیسری قسم کی آیات کے حوالہ جات تشکیلِ جدید میں جامع طور پر نہیں دیے گئے (یعنی جس طرح ایم سعید شیخ نے کاوش و محنت سے ایسی تمام آیات کو جمع کیا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہیں)۔ اس لیے ایسی آیات کے لیے ایم سعید شیخ کے انگریزی ایڈیشن میں دیئے گئے حوالوں کے مطابق آیات کا صرف ترجمہ دیا گیا ہے۔ شیخ صاحب نے انتہائی محنت

سے جہاں کہیں متن میں قرآنی آیات کے مطابق مضمون ہے ان آیات کو تلاش کر کے ان کا حوالہ دیا ہے، یہاں ان آیات کا صرف ترجمہ شامل کیا گیا۔ خطبات کے مطالعے اور قرآنی آیات کے ان حوالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے ایک طرف خطبات کی تیاری میں کس قدر عرق ریزی سے کام لیا اور اس کے ساتھ قرآن پاک میں ان کی گہری بصیرت بھی عیاں ہوتی ہے۔



خطبات اقبال میں تفسیر قرآن

جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ علامہ اقبال روایتی معنی میں کوئی مفسر قرآن نہیں تھے البتہ اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن پاک میں غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی ان کی شاعری قرآنی مفاہیم سے بھری پڑی ہے، ان خطبات میں بھی علامہ کی قرآن پاک میں غیر معمولی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ علامہ قرآن پاک کی آیات کو جس معنی میں استعمال کرتے ہیں روایتی مفسرین بھی وہی معنی مراد لیتے ہوں۔ علامہ کے مفاہیم اور روایتی مفسرین کے مفاہیم میں فرق یا اس پر بحث و تمحیص ہمارا منصب نہیں۔ بہ ظاہر کئی ایک مقامات ایسے ہیں جہاں علامہ نے آیات کے جو معنی مراد لیے ہیں روایتی مفسرین وہ معنی مراد نہیں لیتے۔ لیکن یہ بات صرف اردو کے چند مفسرین کی حد تک ہے ورنہ تفاسیر قرآن میں بہت وسعت ہے عین ممکن ہے علامہ نے جو معنی مراد لیے ہوں وہ کسی دیگر تفسیر میں موجود ہوں۔

یہاں موضوع چوں کہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ہے اس لیے صرف اردو کی چند تفاسیر ہی کے حوالے سے تفسیر شامل کی گئی ہے۔ یہاں جن تفاسیر کو سامنے رکھا گیا یا جن کے حوالے شامل ہیں وہ یہ ہیں :

- ۱۔ تفسیر ابن عباس۔ اردو ترجمہ: محمد سعید عارف۔ مکی دارالکتب، لاہور (تین جلدیں)۔
- ۲۔ تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، دارالاشاعت، لاہور ۱۹۹۹ء۔ (بارہ جلدیں)۔
- ۳۔ احسن تفسیر۔ علامہ عنایت اللہ کشرتی۔ الفیصل ناشران کتب، لاہور (ایک جلد)۔
- ۴۔ معارف القرآن۔ مولانا مفتی محمد شفیع۔ ادارہ المعارف کراچی ۱۹۷۲ء۔

- ۵۔ تفہیم القرآن۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
- ۶۔ ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔
- ۷۔ تدبر قرآن۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ فاران فاؤنڈیشن، لاہور۔
- ۸۔ تفسیر عثمانی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔
- اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ حوالے مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی، تفہیم القرآن اور تدبر قرآن سے دیے گئے ہیں۔

خطبات اقبال کی تفہیم اور بالخصوص اردو زبان میں ان کی تشریح و توضیح ایک نہایت دشوار کام ہے اور جیسا ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے کہ ان خطبات کو سمجھنے کے لیے وسیع مطالعہ اور مشرق و مغرب کے فلاسفہ، علماء، فقہاء سے آگاہی ضروری ہے۔ تاہم اردو زبان میں ان خطبات کی تفہیم یا توضیح و تشریح اور تلخیص کے ضمن میں درج ذیل کاوشیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں :

ڈاکٹر عشرت حسین انور نے اقبال کی مابعد الطبیعات پر مقالہ لکھا، جس کا اردو ترجمہ اقبال اکیڈمی نے شائع کیا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب فکر اقبال کے اختتام پر ان خطبات کی تلخیص پیش کی ہے۔

پروفیسر محمد عثمان نے فکر اسلامی کی تشکیل نو کے عنوان سے اسے خطبات کی تلخیص اور توضیح کی ہے۔

وحید الدین خان نے فلسفہ اقبال کے نام سے خطبات کی تلخیص کی ہے۔

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب زندہ رود جو علامہ اقبال کی ایک جامع سوانح عمری ہے، میں ان خطبات کی نہایت عام فہم تلخیص اور توضیح کی ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنی کتاب ”قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل کے

آخری حصے میں خطباتِ اقبال کو موضوع بنایا، ان کی فلسفیانہ بنیادوں کی توضیح کے ساتھ ان کی اہمیت کو واضح کیا۔

محمد سہیل عمر نے اپنی کتاب خطباتِ اقبال نئے تناظر میں خطباتِ اقبال کا فلسفے کی بنیاد پر تنقیدی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر وحید عشرت نے بھی علامہ کے خطبات کا ایک ترجمہ کیا۔

اس کے علاوہ خطبات کے حوالے سے جو کوششیں ہوئی ہیں وہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر یا ان سے استفادہ نہیں کیا جاسکا، یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کے مباحث اور ان موضوعات پر تفصیلی تحقیق ہو چکی ہو اور یہ کوشش بے معنی ٹھہرے۔ ہمیں خطبات کی ایک عام قاری اور معمولی تعلیم رکھنے والے عام آدمی کے لیے خطبات کی تفہیم کی کوشش یا ان کا سب سے عام فہم خلاصہ جسٹس جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود میں نظر آیا اس لیے وہیں سے خطبات کے اہم نکات نقل کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے جسٹس صاحب کے خلاصے یا نکات سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو ایسی صورت میں اعتراف عجز ہے۔



علم اور مذہبی مشاہدات

Knowledge and Religious Experience

خطبے کے اہم نکات

تحصیل علم کے تین ذرائع ہیں، حواس، عقل اور وجدان، تینوں محدود ہیں۔ اگر حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم کی صحت عقل کے ذریعے پرکھی جاسکتی ہے تو وجدان کے ذریعے حاصل کردہ علم کی جانچ بھی عقلی اور عملی معیار کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ عقلی معیار سے مراد ناقدانہ تعبیر ہے اور اس سے فلسفی کام لیتا ہے جب کہ عملی معیار معلومات و مشاہدات کے نتائج کو دیکھنا ہے اور اس سے نبی کام لیتا ہے۔

علمائے ہر دور میں دینی عقائد و اقدار کو عقلی بنیادوں استوار کر کے قابل فہم بنانے کی کوشش کی تاکہ عملی زندگی متزلزل نہ ہو، اقبال کے نزدیک عقل و وجدان میں کوئی بنیادی تضاد نہیں فرق صرف رفتار کا ہے۔ علامہ، برگسان سے اتفاق کرتے ہیں کہ عقل و وجدان ہی کی ایک بلند تریا ترقی یافتہ صورت ہے۔

علامہ کو احساس تھا کہ مسلمان گزشتہ پانچ سو برس سے جمود کا شکار ہیں۔ اور اس عرصے میں یورپ نے انہی مسائل پر غور و فکر کیا اور اب انسانی فکر و تجربہ میں غیر معمولی ترقی ہو چکی ہے اب فلسفہ و مذہب کے مشترک مسائل پر نئے زاویہ سے غور و فکر ضروری ہو چکا ہے ایشیا اور افریقہ کی نئی مسلمان نسل کا تقاضا ہے کہ ان مسائل پر نئے انداز سے غور کیا جائے۔

اقبال قرآنی آیات کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد نہیں اور نہ کوئی کھیل تماشا ہے اور نہ کوئی تکمیل شدہ مظہر ہے جو ناقابلِ تغیر تبدیل ہے۔ انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے جو اپنی گرد و نواح کی بہتری کی خاطر گہری سے گہری آرزوں میں شریک ہو کر، کبھی ان قوتوں سے توافقی پیدا کر کے اور کبھی ان کو اپنے مقصد میں ڈھال کر اپنی اور اس کے ساتھ کائنات کی تقدیر متشکل کر سکتا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں قرآن حکیم جاہِ جا مطالعہ فطرت اور مشاہدہ پر اصرار کرتا ہے اسی لیے مسلمانوں نے طبیعی علوم کی بنیاد رکھی ورنہ اس سے پہلے جتنے تمدن گزرے، انہوں نے تخیل و قیاس سے ظاہر کا راستہ اختیار کیا، یوں انہوں نے مفروضے قائم کر لیے لیکن قوت سے محروم رہے۔ لیکن صرف مفروضوں پر کوئی پائیدار تمدن قائم نہیں ہو سکتا۔ (ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال۔ زندہ رود۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ۱۹۸۷ء۔ جلد سوم، ص ۳۷۲۔)

خطبہ اول میں براہ راست قرآنی آیات ۳۲ مقامات پر تحریر کی گئی ہیں اور کل ۶۱ آیات درج کی گئی ہیں۔

قرآن پاک میں مطالعہ فطرت کی تعلیم

خطبہ اول میں ابتدائی بحث میں علامہ نے اسلامی اور یونانی فکر کا موازنہ کرتے ہوئے قرآن پاک کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کہتے ہیں :

”جب ہم علم کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفہ یونان کے زیر اثر ہوا اور ان کا مقابلہ قرآن پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ یونانی فلسفہ نے مفکرین اسلام کے مطمح نظر میں اگرچہ بہت وسعت پیدا کر دی تھی مگر بہ حیثیت مجموعی قرآن مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی، سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی اس کے نزدیک انسانی مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا، مگر اس کے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی

تعلیمات جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی جیسی حقیر شے بھی وحی الہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر و تبدل کا مشاہدہ کیا جائے، نیز دن رات کے اختلاف تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضا کے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔“ (تشکیل جدید ص ۶۵)

گویا علامہ اقبال کے نزدیک قرآن پاک نے مشاہدے اور تجربے کی دنیا یا حواس سے حاصل شدہ علم پر زور دیا ہے، اور بار بار اس عالم فطرت پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اس ضمن میں درج بالا عبارت میں علامہ نے قرآن پاک کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قرآن پاک کی سورہ نحل کی آیت ہے :

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ (۶۸)

ترجمہ: اور تمہارے خدا نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور (اوپنی اوپنی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔

(۶۸-۱۶)

سورہ نحل کی سورت ہے سوائے چار آیات کے اس میں کفار کو تنبیہ کے ساتھ ساتھ توحید کے دلائل، کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق، مشرکین کی تردید، مومنین کی ہمت افزائی اور قیامت کے ساتھ ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اس نے بخش رکھی ہیں۔ اس آیت سے پہلے آیت نمبر ۶۵ سے ۶۷ تک اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے آسمان کی بارش، زمین کی زندگی، چار پائیوں سے حاصل ہونے والے خالص دودھ اور پھلوں سے حاصل ہونے والی خوراک کا ذکر کیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”شہد کی مکھی کو حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فطرت ایسی بنائی جو باوجود

ادنی حیوان ہونے کے نہایت کاری گری اور باریک صنعت سے اپنا چھتا

پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں تیار کرتی ہے۔ ساری مکھیاں ایک بڑی

مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرماں برداری کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ ان کے سردار کو یعسوب کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مکھیوں کا جلوس چلتا ہے۔“ (تفسیر عثمانی۔ ص ۳۶۲۔)

اس آیت میں لفظ وحی، (وحی) استعمال ہوا، لفظ وحی کے حوالے سے خطبات کے مترجم (سید نذیر نیازی) تصریحات میں لکھتے ہیں :

” لغوی اعتبار سے وحی وہ مخفی اشارہ ہے جس سے گویا بلا قید زمانہ ہمیں طرفۃ العین میں کسی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے، وہ ایک صفت ہے جو خالق کائنات نے زندگی کو عطا کی اور اس لیے اتنی عام ہے، جتنی زندگی، جیسا کہ اوپر کی آیت سے بجا طور پر استدلال کیا جاتا ہے، بل کہ کائنات میں بھی ہر کہیں موجود ہے۔ قرآن پاک نے لفظ وحی کو اس کے لغوی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اصطلاحاً البتہ وحی سے مراد ہے وحی رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جس کی صحت مسلم ہے اور جو اس لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حجت ٹھہرے گی۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۶-۳۱۵۔)

علامہ تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔ وحی اور ایجا عربی زبان کے الفاظ ہیں اور لغت میں ان کے معنی ہیں جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا، خواہ یہ اشارہ رمز و کنایہ استعمال کر کے کیا جائے اشارے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے، اس لیے لفظ وحی اور ایجا یہ دل میں بات ڈال دینے کے معنی میں بھی آتے ہیں، حتیٰ کہ شیاطین کو دلوں میں جو وسوسے ڈالتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (نسیم البیان۔ محمد علی صابونی، ترجمہ۔ المیزان ناشران کتب، لاہور۔ ص ۵۱۔)

خود علامہ نے انھی خطبات میں ایک دوسرے مقام پر وحی کے بارے میں لکھا ہے:

” قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصہء حیات ہے اور ایسا ہی عام ہے جیسے زندگی، یہ دوسری بات ہے کہ جوں جوں اس کا گزر مختلف مراحل سے ہوتا ہے یا یوں

کہیے کہ جیسے جیسے وہ ارتقا اور نشوونما حاصل کرتی ہے ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کسی پودے کا زمین کی پنہائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یہ کسی عضو کا نشوونما یا کسی انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نور اور روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی شکلیں ہیں۔“ (تشکیلِ جدید۔ ص ۱۹۱)

(اس حوالے سے انگریزی متن کے مرتب ایم سعید شیخ نے قرآن پاک کی متعدد

آیات کے حوالے دیے ہیں، یہاں ان کے تراجم نقل کیے جاتے ہیں۔)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ
الْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ صَوًّا تَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَعْقِلُونَ (۱۶۴)

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے
میں اور کشتیوں میں جو لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی
میں جس کو اتارا اللہ نے آسمان سے، پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگے پیچھے
اور پھیلانے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل جو
تابع دار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے بے شک ان سب چیزوں
میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔ (۲ : ۱۶۳)

الْمَ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ
رُكَّامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ
السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ مَّاءٍ بَرِدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَ
يَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ ط يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (۴۳)

يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي
الْأَبْصَارِ (۴۴)

۲- تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک لاتا ہے بادل کو پھر ان کو ملا دیتا ہے پھر ان کو رکھتا ہے تہ بہ تہ، پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس کے بیچ سے اور اتارتا ہے آسمان سے اس میں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے جس پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس سے چاہے، ابھی اس کی بجلی کی کوند لے جائے آنکھوں کو۔ اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو اس میں دھیان کرنے کی جگہ ہے آنکھ والوں کو (۲۳-۲۴، ۲۳)

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيُبْسِطُهُ فِي السَّمَاءِ
كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ
خِلْفِهِ ۗ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا إِذَا هُمْ
يَسْتَبْشِرُونَ (۴۸)

۳- اللہ ہے جو چلاتا ہے ہوائیں پھر اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ، پھر تو دیکھے مینہ کو نکلتا ہے اس کے بیچ میں سے جب اس کو پہنچاتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں، تب ہی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے (۳۰-۳۸)

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيُسْقِنُهُ إِلَى
بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ كَذَلِكَ
النُّشُورُ (۹)

۴- اور اللہ ہے جس نے چلائی ہیں ہوائیں، پھر اٹھاتی ہیں بادل کو، پھر ہانک لے گئے ہم اس کو مردہ دیس کی طرف، پھر زندہ کر دیا ہم نے اس سے زمین کو مر جانے کے بعد اسی طرح ہوگا جی اٹھنا۔ (۳۵-۹)

وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَاتٍ

لِقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ (۵)

۵- اور بدلنے میں رات دن کے اور وہ جو اتاری اللہ نے آسمان سے روزی پھر زندہ کر

دیا اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد اور بدلنے میں ہواؤں کے نشانیاں

ہیں ان لوگوں کے واسطے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ (۴۵ : ۵)

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (۱۶)﴾

۶- اور ہم نے بنائے آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں (۱۵:

(۱۶)

قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ

كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (۶)

۷- تو کہ اس کو اتارا اس نے جو جانتا ہے چھپے ہوئے بھید آسمان میں اور زمین میں،

بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۵-۶)

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ (۶)﴾

۸- ہم نے رونق دی سب سے ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں۔ (۳۷-۶)

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ

أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِبَصَائِعِ وَحِفْظًا ذَلِكَ

تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۱۲)

۹- پھر کر دیئے سات آسمان دو دن میں اور اتارا ہر آسمان میں حکم اس کا اور رونق دی ہم

نے سب سے ورلے آسمان کو چراغوں سے اور محفوظ کر دیا اور یہ سادھا ہوا ہے ایک

زبردست خبردار کا۔ (۴۱-۱۲)

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا

مِنْ فُرُوجٍ (۶)

۱۰- کیا نہیں دیکھتے آسمان کو اپنے اوپر کیسا ہم نے بنایا اور رونق دی اور اس میں نہیں کوئی

سوراخ (۵۰-۶)

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا
لِلشَّيْطَانِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ (۵)

۱۱۔ ہم نے رونق دی سب سے ور لے آسمان کو چراغوں سے اور ان میں رکھی ہے ہم
نے پھینک مار شیطانوں کے واسطے اور رکھا ان کے واسطے عذاب دکھتی آگ،
کا۔ (۶۷-۵)

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ (۱)

۱۲۔ قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں۔ (۸۵-۱)

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ
فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۳)

۱۳۔ اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند سب اپنے اپنے گھر
میں پھرتے ہیں (۲۱-۳۳)

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ
ط وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۴۰)

۱۴۔ نہ سورج سے ہو کہ پکڑ لے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن سے اور ہر کوئی ایک
چکر میں پیرتے ہیں۔ (۳۶-۴۰)

اعضا و جوارح جواب وہ ہیں :

علامہ اسی حوالے سے آگے چل کر لکھتے ہیں :

”سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت ہی رہی۔

اس کا خیال تھا ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا، ہم اس کی

بنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے قرآن مجید نے سمع و

بصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا ہے اور عند اللہ اپنے اعمال

و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔“ (تشکیل جدید، ص ۵۔)

یہاں علامہ نے جس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قرآن پاک میں متعدد

مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثلاً :

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۖ
وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ (۷۸)

۱- اور اللہ نے تم کو نکالا تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیے تم کو کان اور آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو۔ (۷۸-۷۹)

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا
تَشْكُرُونَ (۷۸)

۲- اور اسی نے بنا دیے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو۔ (۷۸-۷۹)

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَ
الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۹)

۳- پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اس میں جان اور بنا دیے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل تم سب تھوڑا شکر کرتے ہو۔ (۹-۱۰)

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ
وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۲۳)

۴- تو ہی کہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا اور بنا دیے تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو۔ (۲۳-۲۴)

لوح محفوظ

”جہاں تک اظہار ذات کا تعلق ہے فکر کی مثال ایک کل کی ہے جسے اگر بقید زمانہ دیکھیے تو قطعی تخصیصات کے ایک سلسلے کی شکل اختیار کرے گا اور جن کا ادراک ہم ایک دوسرے کے حوالے ہی سے کر سکیں گے۔ بہ الفاظ دیگر ان کے کچھ معنی ہیں تو اپنے ذاتی تشخص میں نہیں بل کہ اس وسیع تر کل کے جس

کے وہ مخصوص پہلو ہیں اور جسے قرآن پاک نے لفظ لوح محفوظ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ یہ لوح محفوظ ہی وہ کل ہے جس میں علم کے جملہ غیر معین امکانات ایک حقیقتِ حاضرہ کی طرح شروع ہی سے موجود ہیں اور جو زمان متسلسل میں اظہارِ متناہی تصورات کے ایک ایسے تواتر کی شکل میں کر رہا ہے جس کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب تصور کسی وحدت میں ضم ہو جائیں گے جو ابتدا ہی سے ان میں مضمر ہے۔“ (تشکیلِ جدید۔ ص ۹-۱۰)

لفظ لوح محفوظ قرآن حکیم کی سورہ البروج کی آیت نمبر ۲۲ میں آیا ہے :

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ (۲۱) فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (۲۲)۴

ترجمہ: بل کہ یہ قرآنِ عظیم الشان ہے۔ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔ (۸۵-)

(۲۲-۲۱)

لوح محفوظ کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں :

طبرانی نے حضرت ابن عباس کی روایت میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے لوح محفوظ کو سفید موتی کا بنایا اور اس کے صفحات یا قوت کے قلم نور کا اور تحریر نور کی ہے، ہر روز تین سو ساٹھ لحات میں اللہ پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، موت و زندگی عطا کرتا ہے، عزت اور ذلت اور جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ محفوظ لوح کی صفت ہے، لوح شیطانوں سے اور کمی بیشی سے محفوظ ہے، اسی لیے اس کو لوح محفوظ کہا جاتا ہے، یہ ام الکتاب بھی ہے اسی سے الکتاب (یعنی قرآن) کو نقل کیا گیا ہے، نافع کی قرأت میں ”محفوظ“ آیا ہے اس وقت یہ قرآن کی صفت ہوگی، اللہ نے فرمایا (ترجمہ) ہم نے اس کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس لیے ممکن نہیں کہ اس میں کسی دوسری عبادت کا الحاق کر دیا جائے اللہ خود اس کا محافظ اور اس کی عبارت بھی اعجازی ہے نہ اس میں رد و بدل ممکن ہے نہ کچھ حذف کر دینا۔“ (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ جلد ۱۱، ۱۲ دارالاشاعت

لاہور ۱۹۹۹ ص ۲۳۵)

کائنات کی نوعیت

علامہ نے پہلے خطبے کے آغاز میں کچھ مباحث، یونانی فکر کے نقائص اور اس کے مقابل اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کے بعد اسلامی اور مغربی فکر پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے، بالخصوص ابن رشد، امام غزالی اور اہل مغرب میں کانٹ کے افکار و تصورات کا موازنہ اور ان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد عالم اسلام کے پانچ صدیوں کے فکری جمود اور مغربی فکر اور سائنس کی ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلامی فکر کے جائزے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”لہذا وقت ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کا جائزہ لیں، چنانچہ ان خطبات میں بھی میرا یہی ارادہ ہے کہ اسلام کے بعض اساسی افکار کی بحث فلسفیانہ نقطہ نظر سے کروں تاکہ اور نہیں تو بہت ممکن ہے ہم اس حقیقت کو آسانی سے سمجھ سکیں کہ بہ حیثیت ایک پیغام کے جس کا خطاب ساری نوع انسانی سے ہے اسلام کے معنی کیا ہیں؟ مزید یہ کہ اس طرح سے جو سلسلہ بحث قائم ہو اس کا ایک بنیادی ساخا کہ قائم کرنے کے لیے ہم اس تمہیدی خطبے میں اس مسئلے پر بھی نظر ڈالیں کہ علم کی نوعیت کیا ہے اور مذہبی مشاہدات کیا کیا۔ (تشکیل جدید۔ ص ۱۳)

علامہ کے نزدیک

”اسلام نے مجاز اور حقیقت یا عینی اور واقعی کو دو متضاد اور متخالف قوتیں نہیں ٹھہرایا کہ ان میں باہم کوئی مصالحت ہی ممکن نہ ہو اور عینی کی ہستی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس کا رشتہ واقعی سے کلیتاً منقطع ہو جائے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۴)

دونوں کا (اسلام اور عیسائیت) مطالبہ ہے کہ ہم روحانیت کا اثبات کریں جو ہمارے اندر موجود ہے۔ اختلاف ہے تو اتنا کہ اسلام نے عینی اور واقعی یا حقیقت اور مجاز کے اتصال کا اعتراف کرتے ہوئے دنیائے مادیات کو رد نہیں کیا بلکہ لیک کہتے ہوئے اس کی تسخیر و تصرف کا راستہ

سچائی ہے جو صحیفہ فطرت ہے اس کے سوا دوسری کوئی سچائی نہیں، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک نہیں چودہ بار صرف اس شے کو دھرایا گیا ہے کہ صحیفہ فطرت واحد حقیقت ہے اور انسان کو چاہیے کہ صرف اس شے کو جو اس کی آنکھ (بصر) دیکھے کان (سمع) سنیں اور اس کا ذہن (فواد) سمجھے حقیقت سمجھے۔“ (احسن تفسیر۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی۔ الفیصل ناشران کتب،

لاہور۔ ص ۸۰۷)

یعنی اتنا بڑا کارخانہ کوئی کھیل تماشا نہیں بنایا بل کہ بڑی حکمت سے بنایا گیا ہے جس کا نتیجہ ایک دن نکل کر رہے گا وہی نتیجہ آخرت ہے۔ (تفسیر عثمانی۔ ص ۶۶۱)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :

”فرمایا کہ ہم نے آسمانوں اور زمین، ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنایا بل کہ ایک برتر غایت اور ایک مقصد حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس مقصد حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو اور اس کے بعد ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق لوگوں کو انعام دے جنہوں نے اس کی پسند کے مطابق زندگی گزاری ہو۔“ (تدبر قرآن۔ جلد ہفتم، امین احسن اصلاحی۔ فاران فاؤنڈیشن، لاہور ص ۲۸۹-۲۹۰۔)

اس موضوع پر ایم سعید شیخ نے مزید آیات پیش کی ہیں یہاں ان کا ترجمہ دیا جاتا

ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبِينِ (۱۶)

۱۔ اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے بیچ ہے کھلتے ہو

ئے۔ (۱۶-۲۱)

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَ
يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هَذَا بَاطِلًا ۗ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

۲۔ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے، اور فکر کرتے ہیں، آسمان اور زمین کی پیدائش میں، کہتے ہیں اے رب ہمارے تو نے یہ عبرت نہیں بنایا، تو پاک ہے سب عیبوں سے ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے (۱۹۱-۳)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ
الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ

۳۔ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو (کائنات) ان میں ہے اس کو خالی از مصلحت نہیں پیدا کیا۔ یہ ان کا گمان ہے جو کافر ہیں سو کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ (۲۷:۳۸)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَ الْقَمَرَ نُورًا وَ قَدَّرَ رَا
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ
ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۵)

۴۔ اور وہ خدا ہے جس نے سورج کو شعلہ بنا دیا ہے اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم سنوں کی گنتی کر سکو اور حساب کر لو۔ خدا نے پیدا نہیں کیا مگر ساتھ حقیقت کے ان اشاروں کو علم والی قوم کے فائدے کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ (۵-۱۰)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ إِنَّ
إِشْرَاقَ يَدَيْهِ يُغْنِيكُمْ وَيَأْتِي بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۹)

۵۔ لوگو کیا تم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ خدا نے آسمانوں کو زمین کو دل لگی یا مخول کے طور پر نہیں بنایا بل کہ اس کی ہر بات ایک مستقل حقیقت ہے اور راہ راست پر چل رہی ہے۔ (۱۹-۱۴)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ
وَإِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَبِيلِ (۸۵)

۶۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو (مخلوقات) ان میں ہے اس کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا اور قیامت تو ضرور آ کر رہے گی تو تم (ان لوگوں سے) اچھی طرح درگزر کرو (۱۵-۸۵)

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ط تَعْلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳)

۷۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی بر حکمت پیدا کیا اس کی ذات ان (کافروں) کے شرک سے اونچی ہے۔ (۱۶-۳)

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ

۸۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طریقے پر بنایا اور ان مضامین میں اہل ایمان کے لیے بڑی دلیل ہے۔ (۲۹-۲۴)

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ قَف مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ط وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُونَ (۸)

۹۔ کیا انھوں نے اپنے دل پر غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کو حکمت سے اور ایک وقت مقرر تک کے لیے پیدا کیا ہے اور بہت سے لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کے قائل ہی نہیں۔ (۳۰-۸)

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۲)

۱۰۔ اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۵-۲۲)

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ

مُسَسَّى ط وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُذِرُوا مُعْرِضُونَ (۳)

۱۱۔ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے مٹی برحمت اور ایک وقت مقرر کے لیے پیدا کیا ہے اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ (۳۶-۳۷)

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ ۗ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۳)

۱۲۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کو مٹی برحمت پیدا کیا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی پاکیزہ بنائیں اور اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے (۶۳-۳)

کائنات ایک حقیقت ہے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (۱۹۰) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۗ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا، تو پاک ہے تو (قیامت کے دن ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔ (آل عمران ۳: ۱۹۰-۱۹۱)

یعنی عقل مند آدمی جب آسمان اور زمین کی پیدائش، ان کے عجیب و غریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط اور محکم نظام پر غور کرتا ہے تو اسے یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ کسی مختار کل اور قادر مطلق فرماں روا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر رکھی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے

محدود وجود اور دائرہ عمل سے باہر قدم نکال سکے، اگر اس عظیم الشان مشین کا ایک ایک پرزہ یا اس کارخانہ کا ایک مزدور بھی مالک علی الاطلاق کی قدرت و اختیار سے باہر ہو تو مجموعہ عالم کا یہ مکمل نظام ہرگز قائم نہ رہ سکتا۔

”یعنی کسی حال خدا سے غافل نہیں ہوتے، اس کی یاد ہمہ وقت ان کے دل میں اور زبان پر جاری رہتی ہے جیسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، کان یذکر اللہ علی کل۔۔۔ نماز بھی بہت بڑی یاد ہے اس لیے آپ نے فرمایا کہ جو کھڑا ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر اور بیٹھ کر نہ پڑھ سکے لیٹ کر پڑھ لے۔ بعض روایات میں ہے کہ جس رات یہ آیات نازل ہوئیں نبی کریم کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حالت میں اللہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ (تفسیر عثمانی۔ ص۔ ۹۷)

۲۔ سورہ پاک کا اختتام ان آیات سے کیا اور اہل علم کو ان میں فکر و نظر کی دعوت دی، کیوں کہ کارخانہ قدرت کی نیرنگیوں پر وہ جتنا غور و فکر کریں گے اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور اس کے علم محیط اور حکمت کاملہ پر ان کا ایمان پختہ ہوگا اور پختگی تقلیدی نہیں ہوگی بل کہ تحقیقی ہوگی۔ (ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور جلد اول، ص ۳۰۷، س ن)

۳۔ ان ارباب بصیرت کا بیان ہو رہا ہے جو اللہ کو ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر برابر غور کرتے رہتے ہیں، فرمایا کہ یہ ذکر و فکر خود بہ خود اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے جتنا ظاہر ہو رہا ہے بل کہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جس میں گناہ گار اور نیکو کار دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے ظاہر ہو۔ (تدبر قرآن۔ امین احسن اصلاحی۔ ص ۲۲۷)

کائنات میں مزید وسعت کی گنجائش ہے

کائنات کی نوعیت ہی کے حوالے سے علامہ مزید لکھتے ہیں :

”اور اس (کائنات) کی ترکیب بھی اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں مزید

وسعت کی گنجائش ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۶)

یہاں ترجمے میں سورہ فاطر کی پہلی آیت کا صرف ایک حصہ یہاں شامل کیا گیا، جس کا ترجمہ ہے۔ اور مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے (بڑھا دیتا ہے پیدائش میں جو چاہے) پوری آیت جو سورہ فاطر کی پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یوں ہے :

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا
أُولَىٰ أَجْنِحَةٍ مِّثْنَىٰ وَثُلُثٌ وَرُبْعٌ ۖ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا
يَشَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱)

ترجمہ: سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جن کے دودو، تین تین اور چار چار پر ہیں وہ اپنی مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱-۳۵)

یہاں فرشتوں کے پروں کا ذکر ہے علامہ نے اسے کائنات کے توسیع ہونے کے معنوں میں لیا ہے۔

- ۱- علامہ عنایت اللہ المشرقی کے نزدیک پروں سے مراد مختلف قوتیں ہیں۔
- ۲- یعنی اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو عضو اور صفت چاہے اپنی حکمت کے موافق بڑھا دے، فرشتوں کے دودو تین تین یا چار بازو یا پر اس نے بنائے تو بعض فرشتوں کے پر زیادہ بنا دیے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل کے چھ سو بازو یا پر ہیں اور جاعل الملائکۃ رسلا سے یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کچھ ان وسائط کا محتاج ہے ہرگز نہیں وہ بذات خود ہر چیز پر قادر ہے محض حکمت کی بنا پر ان وسائط کا سلسلہ قائم ہے۔ (تفسیر عثمانی ص ۵۷۹)

۳- ان الفاظ (یزید فی الخلق ما یشاء) سے مترشح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازوؤں کی انتہائی تعداد چار ہی تک محدود نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتوں کو اس سے بھی زیادہ بازو عطا فرمائے ہیں، حدیث میں عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ نبی صلی

اللہ وعلیہ وآلہ وسلم نے جبریل کو ایک مرتبہ اصل شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔ تفہیم القرآن۔ (مولانا مودودی، جلد چہارم، ص ۲۱۸۔)

کائنات جامد اور تکمیل شدہ نہیں

”یہ کائنات کوئی جامد کائنات نہیں، نہ ایک ایسا مصنوع ہے جس کی تکمیل ختم ہو چکی ہے اور جو بے حس و حرکت اور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے، برعکس اس کے معلوم ہوتا ہے اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے۔“
(تشکیل، ص ۱۶)

علامہ نے یہاں قرآن مجید کی سورہ العنکبوت کی آیت نمبر ۲۰ کا ایک حصہ پیش کیا ہے۔
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۰) ۚ

ترجمہ: کہ دو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے پھر خدا ہی کچھلی پیدائش پر پیدا کرے گا بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۰-۲۹)

”یہی عنوان قدرے تفاوت عنوان سے سنانے کے لیے حضور صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں سے کہیے کہ تم لوگ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا، پھر کچھلی بار بھی پیدا کرے گا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے پہلے عنوان میں ایک عقلی استدلال ہے اور دوسرے میں حسی جس کا تعلق احوال کائنات کے مشاہدہ سے ہے۔“

(معارف القرآن۔ ادارہ المعارف، کراچی۔ مولانا مفتی محمد شفیع، جلد ششم۔ ص

۶۷۱ طبع اول اکتوبر ۱۹۷۲۔)

یعنی اپنی ذات کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پیدائش پر غور کرو اور چل پھر کر دیکھو کہ

کیسی کیسی مخلوق اللہ نے پیدا کی ہے اس پر دوسری زندگی قیاس کر لو، اس کی قدرت کچھ محدود نہیں۔ (تفسیر عثمانی، ص ۵۳۰)

یہ اس دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطہ نگاہ سے غور کرنے کی دعوت ہے، اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ یہ تمام حقائق کی تعلیم کے لیے خود اپنے وجود کے اندر ایک مکمل تربیت گاہ ہے۔

فرمایا کہ اس زمین میں چلو پھرو اور غور کی نگاہ سے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کا آغاز فرماتا ہے اور پھر اس کو فنا کر کے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ ایک قوم کو وجود بخشتا ہے پھر اس کو مٹا کر دوسری قوم لاتا ہے۔ رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے، خزاں کے بعد بہار آجاتی ہے، یہ سارے مشاہدات وہ اس لیے کر رہا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان تصور نہ کرے۔ (تدبر قرآن، جلد ششم، ص ۳۱۔)

علامہ نے اس آیت مبارکہ کو زیادہ وسیع معنوں میں لیا ہے۔

زمانے کی روانی آیات الہی میں سے ہے

”دراصل کائنات کا یہ پراسرار اہنزاز اور تحریک، علیٰ ہذا زمانے کی یہ خاموش روانی، جس کا احساس ہم انسانوں کو دن اور رات کی گردش سے ہوتا ہے، قرآن پاک کے نزدیک بہت بڑی آیت ہے اللہ کی۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۶)

اس موقع پر علامہ نے سورہ نور کی آیت نمبر ۴۴ پیش کی ہے :

يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي
الْأَبْصَارِ (۴۴)

ترجمہ: اور خدا ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ اہل بصارت کے لیے اس

میں بڑی عبرت ہے۔ (۲۴-۲۳)

۱۔ اور اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے کہ رات ختم ہوئی اور دن آیا اور دن پورا کیا تو رات کو لایا ان تمام مذکورہ بالا چیزوں میں دین میں سمجھ اور بصیرت رکھنے والوں یا صرف

آنکھوں سے دیکھنے والوں کے لیے استدلال کا موقع ہے۔ (تفسیر ابن عباس، ترجمہ محمد سعید عاطف، مکی دار لکتب، لاہور، جلد دوم۔ ص ۳۶۵۔)

- ۲۔ اسی طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لانا بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ رات میں دن ظاہر کر دے یا دن میں رات نمودار کر دے یا ان کی آمد و شد میں منٹ یا سیکنڈ کا فرق ہی پیدا کر دے۔ فرمایا کہ ان تمام باتوں کے اندر جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اہل نظر کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔ (مدبر قرآن۔ جلد پنجم۔ ص ۲۲۱)
- ۳۔ یعنی چاہیے کہ قدرت کے ایسے عظیم الشان نشانات دیکھ کر آدمی بصیرت اور عبرت حاصل کرے اور اس شہنشاہ حقیقی کی طرف سچے دل سے رجوع کرے جس کے قبضہ قدرت میں ان تمام تصرفات اور تقلبات کی باگ ہے (تفسیر عثمانی۔ ص ۴۷۵)

دعوتِ تسخیر کائنات

”در اصل زمان و مکان کی یہ عظیم وسعت اس امر کی منتظر ہے کہ انسان کا دست تسخیر اسے پورے طور پر مسخر کرے، اس کا فرض ہے آیات الہی پر غور کرے اور اس طرح ان ذرائع کی تلاش میں قدم اٹھائے جن کی بدولت وہ فی الحقیقت فطرت پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۶)

اگرچہ قرآن پاک میں جاہہ جاہہ تسخیر کائنات کی دعوت دی گئی ہے۔ تاہم علامہ اقبال نے یہاں دو الگ الگ آیات پیش کی ہیں جو سورہ لقمان اور سورہ النحل سے ہیں۔ پہلے سورہ لقمان کی آیت نمبر ۲۰:

الْمُتَرَدِّدَاتُ أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَ بَاطِنَةً ط وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ لَا هُدًى وَ لَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ (۲۰)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے

سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں نہ علم رکھتے ہیں اور نہ ہدایت اور نہ روشن کتاب۔ (۲۰-۳۱)

یعنی ایسے کھلے انعام اور احسان کے باوجود بعض لوگ آنکھیں بند کر کے اللہ کی واحدانیت میں اس کے شیون و صفات میں یا اس کے احکام میں جھگڑتے ہیں اور محض بے سند جھگڑتے ہیں، نہ کوئی عملی، عقلی اصول ان کے پاس ہے نہ کسی ہادی برحق کی ہدایت نہ کسی مستند اور روشن کتاب کا حوالہ، محض باپ دادا کی اندھی تقلید ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۵۴۹)

کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک معنی میں مسخر نہیں کر دیا، بل کہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں، مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ نباتات اور معدنیات، مویشی وغیرہ، بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند سورج وغیرہ دوسرے معنی میں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم ص ۱۹-۲۰)

اسی حوالے سے علامہ نے سورہ النحل کی بارہویں آیت بھی درج کی ہے :

وَ سَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۚ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ط وَ النُّجُومَ
مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِہ ط ۙ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یَعْقِلُوْنَ (۱۲)

ترجمہ: اور اسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا اور اسی کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں، سمجھنے والوں کے لیے اس میں (قدرت خدا کی بہت سی) نشانیاں ہیں۔ (۱۲-۱۶)

رات اور دن برابر ایک دوسرے کے پیچھے لگے چلے آتے ہیں تا دنیا کا کاروبار چلے اور لوگ

سکون و آرام حاصل کر سکیں، اسی طرح چاند سورج ایک معین نظام کے ماتحت نکلتے چھپتے ہیں رات اور دن کی آمد و شد اور شمس و قمر کے طلوع و غروب کے ساتھ انسانوں کے بے شمار فوائد وابستہ ہیں بل کہ غور سے دیکھا جائے تو ان کے بدوں انسان کی زندگی محال ہے، خدا تعالیٰ نے اپنے اقتدار کامل سے چاند سورج اور ستاروں کا ان کے مزدوروں کی طرح ہمارے کاموں میں لگا رکھا ہے۔ مجال نہیں کہ ذرا سی سستی یا سرتابی کر سکیں۔ (تفسیر عثمانی۔ ۳۵۵)

ان چیزوں کو خدا نے تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھا ہے لیکن عجیب ماجرا ہے کہ خدا نے تو ان چیزوں کو تمہاری خدمت میں سرگرم کیا کہ تم اس کے شکر گزار بنو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جس نے انسان کی نفع رسانی کے لیے اپنی یہ شانیں اور قدرتیں دکھائی ہیں وہ اس کو غیر مسئول اور مطلق العنان نہیں چھوڑے گا۔، (مدبر قرآن، جلد چہارم۔ ص۔ ۳۹۶)

مدارج حیات میں انسان کا درجہ

کائنات کی اس ماہیت اور حقیقت کو بیان کرنے کے بعد علامہ نے خود انسان کی طرف توجہ کی ہے کہ :

”اس کائنات میں اور مدارج حیات میں خود انسان کی حقیقت کیا ہے، لیکن اگر یہ ماہیت ہے کائنات کی اور کچھ اس قسم کی توقعات میں جو ہم اس سے وابستہ کر سکتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود انسان جس کو اس نے چہار طرف سے گھیر رکھا ہے، حقیقت کیا ہے، اپنی صلاحیتوں میں توافقی و تطابق کے باوجود وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا درجہ مدارج حیات میں بڑا پست ہے علیٰ ہذا یہ کہ اسے قدم قدم پر متزاہم قوتوں نے گھیر رکھا ہے۔“ (تشکیلِ جدید۔

(ص۔ ۱۷)

علامہ نے یہاں سورہ واتین کی آیت نمبر ۴، ۵۔ پیش کی ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۴) زُتْمٌ رَدَدْنَاهُ
أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۵)

ترجمہ: کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا، پھر (رفتہ رفتہ)

اس (کی حالت کو بدل کر) پست سے پست کر دیا (۹۵-۴، ۵)

۱- ابن جریر نے عوفی کے طریق سے حضرت عباس سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ وہ لوگ جو حضور کے زمانے میں ذلیل ترین عمر کو پہنچ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ ان کی عقلیں جاچکیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا عذر نازل فرمایا کہ جو حضرات عقلیں زائل ہونے سے پہلے عمل صالح کر چکے ہیں ان کے لیے اجر ہے۔ (تفسیر ابن عباس - جلد سوم، ص ۲۸۳)

۲- لیکن جو انسان ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتا، جو اپنی عدیم النظیر صلاحیتوں کو غلط استعمال کرتا ہے۔ جو عقل و فہم کے سارے چراغ گل کر دیتا ہے اور ہوائے نفس کی پیروی میں لگ جاتا ہے، اپنے خالق و رازق کی فرماں برداری سے منھ موڑ لیتا ہے، اس کے رسول کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو اس جرم کی سزا بڑی سخت دی جاتی ہے وہ بے شعور اور بے سمجھ حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ (ضیاء القرآن - جلد پنجم - ص ۶۰۷)

۳- یحییٰ بن یحییٰ میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ ہر بچہ کی پیدائش اسلام پر ہوتی ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ فرق اس آیت و حدیث میں اتنا ہے کہ آیت میں انسان کو افضل بنا دینے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔ (تفسیر مظہری - جلد ۱۲ - ص ۳۰۳)

۴- یعنی یہ سب مقامات متبرکہ کہ جہاں ایسے ایسے الوالعزم پیغمبر اُٹھے۔ گواہ ہیں کہ ہم نے انسان کو کیسے اچھے سانچے میں ڈھالا اور کیسی قوتیں اور ظاہری اور باطنی خوبیاں اس کے وجود میں جمع کی ہیں اگر اپنی صحیح فطرت پر ترقی کرے تو فرشتوں پر گویا سبقت لے جائے بل کہ مسجود ملائکہ بنے۔ (تفسیر عثمانی - ص ۷۹۶)

اس حوالے سے ایم سعید شیخ نے سورہ المعارج کی آیت نمبر ۱۹ کا حوالہ بھی دیا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا (۱۹)

ترجمہ: کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ (۱۹-۷۰)

امانت کا تصور

انسان کے مقام و مرتبے کے حوالے سے علامہ مزید لکھتے ہیں :

”اور اس ماحول میں اس کی حالت کیا ہے، ایک بے چین ہستی جو اپنے مقصود و منتہا کی طلب میں دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے اور اظہار ذات کے نئے نئے مواقع کی تلاش میں بڑی بڑی صعوبتیں اور دکھ درد اٹھانے سے گریز نہیں کرتا، جس کو اپنی سب خامیوں کے باوجود فطرت پر تفوق حاصل ہے کیوں کہ اس کی ذات ایک زبردست امانت کی حامل ہے، وہ امانت جس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے، آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں تک نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔“ (تشکیل جدید۔ ص۔ ۱۷)

اس حوالے سے علامہ نے سورہ احزاب کی آیت نمبر ۷۲ کا حوالہ دیا ہے :

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ
فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ
كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۷۲)

ترجمہ: ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ (۷۲-۳۳)

۱۔ اس جگہ امانت سے مراد وہی خلافت ہے جو قرآن مجید کی رو سے انسان کو عطا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں ان کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرز عمل پر اجر اور غلط پر سزا کا مستحق بنے، یہ اختیارات چوں کہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے بل کہ اللہ نے اسے دیے ہیں اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے قرآن مجید میں

دوسرے مقامات پر ان کو خلافت سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہاں انھی کے لیے امانت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اور گراں بار ہے اس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آسمان اور زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کو اٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے مگر انسان ضعیف البیان نے اپنی ذرا سی جان پر بھاری بوجھ اٹھالیا ہے۔

زمین و آسمان پر بارِ امانت کا پیش کیا جانا اور ان کا اٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا، ہو سکتا ہے لغوی معنوں میں ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بہ طور استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم سمجھ سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔
(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم ص ۱۳۶)

۲۔ یعنی ستم کر دیئے، جو بوجھ آسمان و زمین اور پہاڑوں سے نہ اٹھ سکتا تھا، اس نادان نازک کندھوں پر اٹھایا، آسمان بارِ امانت نتواں کشید۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں، یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا۔ امانت کیا ہے پرانی چیز رکھنی اپنی خواہش روک کر، آسمان اور زمین وغیرہ میں خواہش کچھ نہیں چاہے تو وہی ہے جس پر قائم ہیں، انسان میں خواہش اور ہے حکم خلاف اس کے۔ اس پرانی چیز (یعنی حکم) کے خلاف اپنے جی کا تھا منابڑا زور چاہتا ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ منکروں کو قصور پر پکڑا جائے اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی۔ ص ۵۶۹)

عمومی تصور کے برعکس علامہ کے نزدیک امانت اٹھانا فضیلت کا باعث ہے۔

زندگی کی ابتدا اور دوامی امکانات

”بے شک اس کی (انسان کی) زندگی کا ایک آغاز ہے لیکن اس کا مقدر شاید

یہ کہ کائنات میں ایک دوامی عنصر بن جائے۔“ (تشکیلِ جدید ص ۱۷)

یہاں علامہ نے سورہ قیامہ کی پانچ آیات پیش کی ہیں :

اَيُّحَسَبُ الْاِنْسَانَ اَنْ يُتْرَكَ سُدًى (۳۶) ط الْم يَكُ نَطْفَةً
 مِّنْ مَّنِيٍّ يُنْسِي (۳۷) ط ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى
 (۳۸) ط فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثَى (۳۹) ط
 اَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدْرِ عَلَى اَنْ يُحْيِيَ نَسْمَةً (۴۰) ء
 ترجمہ: کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ منی کا جو
 رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا۔ پھر وہ لوتھڑا ہوا، پھر (خدا نے) اس کو
 بنایا پھر (اس کے اعضا) کو درست کیا۔ پھر اس کی دو قسمیں بنائیں (ایک)
 مرد (ایک) عورت۔ کیا اس کو اس بات پر قدرت نہیں کہ مردوں کو
 جلا اٹھائے۔ (۴۵-۳۶ تا ۴۰)

ابن جریر نے عوفی کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جس
 وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ علیہا تسعہ عشرہ۔ تو ابو جہل نے قریش سے کہا کہ تمہاری
 مائیں تم پر روئیں ابن ابی کبشہ یعنی حضور بتلاتے ہیں کہ جہنم کے خازن انیس ہیں اور تم پوری دنیا
 ہو، کیا تم میں سے دس آدمیوں سے نہیں ہو سکتا کہ ایک جہنم کے خازن کو پچھاڑ دو، چناں چہ اللہ
 تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی بھیجی کہ اس کے پاس جا کر اس سے کہ
 دیں۔ اولیٰ لك فاوٰلى۔ (تجھ پر افسوس ہے)

۱۔ امام نسائی نے سعید ابن جبیر سے روایت کیا ہے کہ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
 وسلم نے خود فرمایا تھا یا اللہ نے اس چیز کا حکم دیا تھا، حضرت عباس نے فرمایا کہ آپ نے خود فرمایا
 تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو نازل کر دیا۔۔۔ کیا ابو جہل سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی بغیر امر
 و نہی کے چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا ابو جہل ایک منی کا قطرہ نہ تھا جو عورت کے رحم میں ٹپکایا گیا، پھر وہ
 خون کا لوتھڑا ہو گیا، پھر اللہ نے اسے انسان بنایا اور اس کے ہاتھ پیروں اور تمام اعضا کو درست
 کر کے اس میں روح پھونکی۔ (تفسیر ابن عباس، جلد ۷، ص ۴۳۷)

۲۔ تفسیر مظہری میں بھی اس روایت کو بیان کیا گیا ہے (جلد ۱۲، ص ۱۵۰)

انسان ایک تخلیقی فعالیت

علامہ نے تسلسل سے قرآن پاک کی ایسی آیات کے حوالے پیش کیے ہیں، ایسی آیات پیش کی ہیں جن میں کسی نہ کسی طور انسانی فضیلت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے، یا اس کی ذمہ داریوں اور مقام کا اظہار ہوتا ہے، سورہ قیامہ کی آیات پیش کرنے کے بعد علامہ کہتے ہیں :

”جب اس کے گرد و پیش کی قوتیں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں تو وہ ان کو جیسی چاہے شکل دے سکتا ہے اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے، لیکن اگر اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اعماق وجود میں اس سے بھی ایک وسیع تر عالم تیار کر لے، جہاں اس کو لا انتہا مسرت اور فیضان خاطر کے نئے نئے سرچشمے مل جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں آلام ہی آلام ہیں اور اس کا وجود برگ گل سے بھی نازک بایں ہمہ حقیقت کی کوئی شکل ایسی طاقت ور، ایسی نتیجہ خیز اور حسین و جمیل نہیں جیسی روح انسانی۔ لہذا بہ اعتبار اپنی کہنہ کے جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے، انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے۔ ایک صعودی روح جو اپنے عروج و ارتقا میں ایک مرتبہ وجود سے دوسرے میں قدم رکھتا ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۸)

یہاں علامہ نے سورہ انشقاق کی آیات ۱۶ تا ۱۹ پیش کی ہیں :

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱۶) وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ

إِذَا اتَّسَقَ (۱۸) لَتَذْكُبَنَّ ط طبَّقًا عَن طَبَقِ (۱۹)

ترجمہ: ہمیں شام کی سرخی کی قسم، اور رات کی اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کر لیتی ہے ان کی اور چاند کی جب وہ کامل ہو جائے کہ تم درجہ بہ درجہ (رتبہ اعلا پر)

چڑھو گے۔ (۸۴-۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

۱۔ علامہ مشرقی ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ تم انسانوں کا گروہ (ملاقات رب کی کاوش میں) جس کا ذکر اوپر ہوا، صحیفہ فطرت کو مکمل طور پر دریافت کے ولولے میں جانکاہ عمل کرنے بل کہ۔۔ زمین و آسمان سے دو بہ دو اور مساویانہ حیثیت سے ملاقات کا رتبہ

حاصل کرنے کی دھن میں صدیوں تک عمل کرنے کے باعث انسانیت کے ایک طبقے سے بلند تر طبقے تک چڑھتے جاو گے (جس طرح کہ شفق کے نمودار ہونے کے بعد شام تمام اشیا پر حاوی ہو کر ان کو اپنے اندر سما لیتی ہے اور پھر چاند آہستہ آہستہ بڑھ کر کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ (احسن تفسیر۔ المشرقی۔ ص ۹۶۱)۔

منصور نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ ماوسق کا، معنی یہ ہے کہ جس چیز کو رات اپنی پیٹ میں لے لے اور تاریکی میں چھپالے، سعید بن جبیر نے کہارات میں جو کچھ کیا جائے (وسق میں داخل ہے)۔ انسانوں کو خطاب ہے کہ اے انسانو قیامت کی منازل میں تم ایک حال کے بعد دوسرے حال میں اور ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت میں ہو گے، مقاتل نے طبق سے مراد لی ہے موت اور موت کے بعد زندگی، عطا نے دنیوی احوال سے تفسیر کی ہے۔ (تفسیر مظہری۔ جلد ۱۲ ص ۲۳۶)۔

تقدیر کائنات کی تشکیل میں انسان کی کاوش

انسانی شرف و فضیلت کے حوالے سے علامہ لکھتے ہیں :

”انسان کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ اس عالم کی گہری سے گہری آرزووں میں شریک ہو جو اس کے گرد و پیش موجود ہے اور اپنی علیٰ ہذا کائنات کی تقدیر خود متشکل کرے کبھی اس کی قوتوں سے توافق پیدا کرتے ہوئے اور کبھی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اپنی غرض و غایت کے مطابق ڈھال کر، اس لحظہ بہ لحظہ پیش رس اور تغیر زائل میں خدا بھی اس کا ساتھ دیتا ہے لیکن شرط یہ کہ پہل انسان کی طرف سے ہو۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۸)

یہاں علامہ نے قرآن پاک کی سورہ الرعد کی ایک آیت کا ایک حصہ پیش کیا ہے۔

پوری آیت کا ترجمہ اس طرح ہے :

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَ لَهُ مِنَ
أَمْرِ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا
بِأَنْفُسِهِمْ ط وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا أَفَلَا مَرَدُّ لَهُ ؕ وَمَا

لَهُمْ مِّنْ دُونِهِ مَنٌ وَّآلٍ (۱۱)

ترجمہ: اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ خدا اس (نعمت) جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب خدا کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر وہ پھر نہیں سکتی اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں۔

(۱۱-۱۳)

اللہ کسی قوم کی امن اور خوش حالی والی حالت میں تبدیلی نہیں کرتے جب تک وہ لوگ شکر خداوندی ترک کر کے اپنی حالت خود تبدیل نہیں کرتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب اور ہلاکت تجویز کر لیتا ہے تو پھر ان سے فیصلہ خداوندی کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور اللہ کے سوا پھر کوئی ان سے عذاب خداوندی ہٹانے والا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ ہے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد دوم، ص ۱۰۷)

قوموں کے عذاب کے معاملے میں اصل سنت اللہ کی وضاحت فرمادی کہ اللہ تعالیٰ اپنا معاملہ کسی قوم کے ساتھ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے، جب قوم خود اپنی روش بدل لیتی ہے اور تنبیہ و انداز کے باوجود متنبہ نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس پر وہ عذاب بھیجتا ہے جس کو کوئی طاقت دفع نہیں کر سکتی۔۔۔ (مدبر قرآن، جلد چہارم، ص ۲۷۵)

حاصل یہ ہے کہ اللہ کل شانہ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لیے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے، لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا اور اس کی اطاعت چھوڑ کر بد عملی، بد کرداری اور سرکشی اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب ان پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں تغیر احوال سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم اطاعت اور شکر گزاری چھوڑ کر اپنے حالات میں بُری تبدیلی پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرزِ رحمت اور حفاظت بدل دیتے ہیں۔

(معارف القرآن، جلد پنجم، ص ۱۷۱)

درج بالا آیت کے بعد تشکیل میں جو عبارت ترجمہ کی گئی ہے اس حوالے سے حاشیے میں کسی آیت کا ذکر نہیں تاہم ایم سعید شیخ نے اس کے انگریزی متن کے ساتھ حاشیے میں کچھ آیات کے حوالے دیے ہیں یہاں تشکیل سے اقتباس اور ساتھ آیات کا ترجمہ دیا جاتا ہے :

”لیکن اگر وہ پہل نہیں کرتا، اپنی ذات کے وسعتوں اور گونا گوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا، زندگی کی بڑھتی ہوئی رو کا کوئی تقاضا اپنے اندرون ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ اس کی زندگی، علیٰ ہذا پے بہ پے ترقی پذیر روح کے سفر کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس حقیقت سے رابطہ پیدا کرے جس نے اس کا ہر چہار طرف سے احاطہ کر رکھا ہے۔“

(تشکیل جدید۔ ص ۱۹)

اس موضوع کے حوالے سے ایم سعید شیخ نے درج ذیل مزید آیات کا حوالہ دیا ہے :

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۖ وَإِن مِّن الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۖ وَإِن مِّنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيُخْرِجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۖ وَإِن مِّنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۖ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۷۴)

۱۔ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، گویا پتھر ہیں یا ان سے سخت، اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور نکلتا ان میں سے پانی اور خدا تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں۔ (۷۴-۷۳)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعْنُهُمْ ۖ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ۗ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۗ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳)

۲۔ تو ان لوگوں کا عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں جن باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ان کا ایک حصہ بھی فراموش کر بیٹھے اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو، تو ان کی خطائیں معاف کر دو اور (ان سے) درگزر کرو کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (۵-۱۳)

فَلَوْ لَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۳)

۳۔ تو جب ان پر ہمارا عذاب آتا ہے کیوں نہیں عاجزی مگر ان کے تو دل ہی سخت ہو گئے تھے اور جو وہ کام کرتے تھے شیطان ان کو (نظروں میں) آراستہ کر کے دکھاتا تھا۔ (۶-۲۳)

أَفَسِنَّ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ ط
فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ ط أُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ (۲۲)

۴۔ بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو (تو کیا وہ سخت دل کافر کی طرح ہو سکتا ہے) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں اور یہی لوگ صریح گم راہی میں ہیں۔ (۳۹-۲۲)

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ط وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ (۱۶)

۵۔ کیا ابھی تک مومنوں کے لیے اس کا وقت نہیں آیا کہ خدا کی یاد کرنے

کے وقت اور (قرآن جو خدائے برحق کی طرف) سے نازل ہوا ہے اس کے سننے کے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں، جن کو (ان سے) پہلے کتابیں دی گئیں پھر ان پر زمانہ طویل گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ (۵۷-۱۶)

انسان کی فضیلتِ علم

”اس زندگی میں علیٰ ہذا پے بہ پے ترقی پذیر روح کے سفر کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس حقیقت سے رابطہ پیدا کرے جس نے اس کا ہر چہار طرف سے احاطہ کر رکھا ہے۔ یہ رابطے علم کی بدولت قائم ہوتے ہیں اور علم عبارت ہے ادراکِ بالْحَس سے، جس سے ہم اپنی عقل و فہم کی مدد سے زیادہ وسعت پیدا کر لیتے ہیں۔ (تشکیلِ جدید۔ ص ۱۹)

سورہ البقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۳ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ
 قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۗ
 وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا
 تَعْلَمُونَ (۳۰) وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
 عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰٓؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ
 صٰدِقِينَ (۳۱) قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا بِهٰٓؤُلَاءِ مَا عَلَّمْتَنَا ۗ
 إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۳۲) قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ
 بِأَسْمَائِهِمْ ۗ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۗ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ
 إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَ أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَ
 مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (۳۳)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک نائب بنانے والا ہوں،

انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں (خدا نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اور اس نے (آدم کو سب چیزوں کے) نام سکھائے پھر ان فرشتوں کو سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا اور حکمت والا ہے۔ (تب) خدا نے (آدم کو) حکم دیا کہ آدم تم ان چیزوں کے نام بتاؤ، جب انہوں نے نام بتائے تو (فرشتوں سے) فرمایا کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور پوشیدہ کرتے ہو۔

(۲: ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳)

خود علامہ ان آیات کے حوالے سے کہتے ہیں :

ان آیات میں یہ نکتہ مضمون ہے کہ انسان کو تسمیہ اشیا کی قدرت حاصل ہے، یعنی وہ ان کے معانی قائم کر سکتا اور معانی قائم کرنا گویا ان کو قابو میں لے آنا ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۹)

۱۔ اس سے علم فضیلت عبادت پر ثابت ہوتی ہے، دیکھیے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چوں کہ انسان سے کم ہیں اس لیے مرتبہ خلافت انسان کو ہی عطا ہوا اور ملائکہ نے اس کو تسلیم کر لیا اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے کیوں کہ عبادت تو خاصہ مخلوقات ہے خدا کی صفت نہیں ہے البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفت اعلا ہے اس لیے قابل خلافت یہی ہوئے کیوں کہ ہر خلیفہ میں مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

(تفسیر عثمانی، ص ۸)

علامہ عنایت اللہ المشرقی ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

۲۔ کائنات کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے پہلی شے جو جاننے کے لائق ہے یہ ہے کہ انسان کا اس کائنات میں مقام کیا ہے اس مسئلے میں انسان ہزار ہا سال تک صحیفہ فطرت کی مختلف اشیا سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ انبیاء نے انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں خدا کے وجود کا احساس دلایا مگر انسان کے سمع و بصر اور ذہن کے ابتدائی حالت میں ہونے کی وجہ سے یہ تخیل اکثر نقش بر آب رہا۔ حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی امتیں خدا کے وجود سے کافی طور پر آشنا رہیں اور مقدم الذکر نے تو، تورات میں انسان کو خدا کے مماثل بھی کہا، مگر یہ امتیں بہت جلد جہالت میں پھنس گئیں اور انسان کا اس کائنات میں صحیح مقام واضح نہ ہو سکا۔ قرآن حکیم نے تمثیلی طرز کلام میں انسان کا اس دنیا میں مقام سب سے پہلے بلغ اور معنی خیز الفاظ میں واضح کیا۔

..... مراد یہ کہ فرشتوں کے پاس وہ اعضا ہی نہ تھے جس سے فطرت کو سمجھتے، اس لیے خدا کا قائم مقام کیا بنتے ان کو تسلی دی گئی کہ تم اس مرتبے کے لائق نہیں، یہ کم بخت انسان ہی اس کا اہل ہے جو خون گراتا ہے فساد مچاتا رہتا ہے، تم تسبیح و تقدیس میں لگے رہو، کیوں کہ تمہارے پاس نافرمانی کی اہلیت ہی نہیں، یہی صاحب ارادہ انسان اس کا اہل ہے کہ میری زمین میں جا کر میرا قائم مقام بنے، وہاں جا کر کچھ سمجھے گا کچھ سوچے گا، تم بے چارے وہاں جا کر کیا کرو گے، غرض فرشتوں کی کوئی بڑی حیثیت انسان کے مقابلے میں نہیں، وہ معلوم ہوتا ہے خدا کی مقرر کردہ بے پناہ قوتیں ہیں جن کے عظیم الشان ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن آنکھ کان اور ذہن جیسے عظیم ہتھیار ان کے پاس نہیں، انسان کی فضیلت انھی اشیا کے باعث ہے جو خلاق فطرت نے ان کو دی ہیں۔ (احسن تفسیر۔ ص۔ ۱۱۔)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو کن کے نام سکھائے، اس سوال کے جواب میں تین قول ہیں، ایک قول ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں، دوسرا قول ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آدم کی ذریت کے نام ہیں۔ اس میں تیسرا قول ہمارے نزدیک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ (تدبر قرآن جلد اول۔ ص۔ ۱۶۰۔ فاران فاؤنڈیشن۔ طبع ۱۹۹۰ء)

قرآن میں حقیقت کے قابل مشاہدہ پہلو کی اہمیت

علامہ نے قرآن پاک کی تعلیم اس خصوصیت کو بیان کیا ہے کہ قرآن نے حقیقت کے قابل مشاہدہ پہلو یعنی علم بالحواس کو بہت اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

” ہمیں کہنا چاہیے کہ علم انسانی کی نوعیت تصوری ہے اور تصوری علم کا یہی حربہ ہے جسے لے کر انسان حقیقت مطلقہ کی سری یا قابل مشاہدہ پہلو کی طرف قدم بڑھاتا ہے، چنانچہ تعلیمات قرآنی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے حقیقت کے اس پہلو کا جس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے بے حد اہمیت دی ہے ہم اس سلسلے میں چند آیات پیش کریں گے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۲۰) (یہاں علامہ نے قرآن مجید کے چار مقامات سے آیات پیش کی ہیں۔)

سب سے پہلے سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۶۴ :

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۱۶۴)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں اور مینہ میں جسے خدا آسمان سے برساتا ہے اور زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز کر دیتا ہے) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے

ہیں عقل مندوں کے لیے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔ (۱۶۴-۲)

۱۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن اور فریابی نے اپنی تفسیر اور امام بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں ابوالضحیٰ سے روایت کیا ہے کہ جب آیت۔ ”الہھکم الہ واحد“۔ نازل ہوئی تو مشرکین نے اظہارِ تعجب کیا اور کہنے لگے وہ واحد ولا شریک ہے، اگر وہ قول میں سچا ہے تو کوئی دلیل لائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ (تفسیر ابن عباس۔ ص۔ ۹۶)

۲۔ یعنی آسمان کے اس قدر وسیع اور اونچا اور بے ستون پیدا کرنے میں زمین کے اتنی وسیع اور مضبوط پیدا کرنے اور اس کے پانی پر پھیلانے اور رات اور دن کے بدلتے رہنے اور ان کے گھٹانے اور بڑھانے میں اور کشتیوں کے دریا میں چلنے میں اور آسمان سے پانی برسانے اور اس سے زمین کو سرسبز و تر و تازہ کرنے میں اور جملہ حیوانات میں اس سے توالد و تناسل نشوونما ہونے میں اور جہات مختلفہ سے ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں معلق کرنے میں دلائل عظیمہ اور کثیرہ ہیں۔ حق تعالیٰ کی واحدانیت اور اس کی قدرت اور حکمت اور رحمت پر ان کے لیے جو صاحبِ عقل و فکر ہیں۔ (تفسیر عثمانی، ص ۳۱)

۳۔ اس کے بعد حق تعالیٰ کے واحد حقیقی ہونے پر تکوینی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جن کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے کہ آسمان اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں کہ ان چیزوں کی پیدائش و بقا میں کسی دوسری ہستی کا دخل نہیں، اس طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسی جوہر سیال بنا دیا کہ اس کی پیٹھ پر لاکھوں من وزنی جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب منتقل کر دیتے ہیں اور ان کو حرکت میں لانے کے لیے ہواؤں کا چلانا اور اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا کوئی علیم وخبیر ہے۔ (معارف القرآن۔ جلد اول۔ ص۔ ۳۵۱)

دوسری سورہ انعام کی آیات ۹۷ تا ۹۹ ہیں :

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتٍ

الْبُرِّ وَالْبَحْرِ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۹۷) وَهُوَ
 الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَبَسْتَقَرُّ وَمُسْتَوْدَعٌ ط قَدْ
 فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (۹۸) وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ
 السَّمَاءِ مَاءً ۚ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ
 خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنَ
 طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ
 مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ط انظروا إلى ثمره إذا أتت
 وَيُنْعِهِ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۹۹)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے
 اندھیروں میں ان سے راستے معلوم کرو۔ عقل والوں کے لیے ہم نے اپنی
 آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اور وہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص
 سے پیدا کیا، پھر (تمہارے لیے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد
 ہونے کی سمجھنے والوں کے لیے ہم نے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر دی ہیں۔
 اور وہی تو ہے جو آسمان سے مینہ برساتا ہے، پھر ہم ہی ہیں (جو مینہ برساتے
 ہیں) اس سے ہر طرح کی روئیدگی اُگاتے ہیں پھر اس میں سبز سبز کونپلیں
 نکالتے ہیں اور ان کونپلوں میں سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے
 دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے لٹکے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ
 اور زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے،
 یہ چیزیں جب پھلتی ہیں اور ان پھلوں پر اور (جب پکتی ہیں تو) ان کے پکنے
 پر نظر کرو ان میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (قدرت کی بہت
 سے) نشانیاں ہیں۔ (۶: ۹۷-۹۹)

تفسیر۔ ۱۔ اس رکوع میں حق تعالیٰ کے جن افعال و صفات اور مظہر قدرت کا بیان ہو
 ہے ان سے خدا کے وجود کی واحدانیت اور کامل الصفات ہونے پر استدلال تو واضح ہے، لیکن

غور کیا جائے تو وحی و نبوت کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے، کیوں کہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہماری دنیوی زندگی مادی حوائج کے انتظام و انصرام کے لیے اس قدر ارضی و سماوی اسباب مہیا فرمائے ہیں تو یہ کہنا کس قدر لغو اور سراسر غلط ہوگا کہ ہماری حیات اخروی اور روحانی ضروریات کے انجام پانے کا کوئی سامان نہیں کیا۔ یقیناً جس رب کریم نے ہماری جسمانی غذاؤں کے نشوونما کے لیے آسمان سے پانی اتارا ہے، ہمارے روحانی تغذیہ کے لیے بھی سحاب ہائے نبوت سے وحی و الہام کی بارش نازل فرمائی ہے، جب وہ بحرِ دبر کے اندھیروں میں ستاروں کے ذریعہ راہ نمائی کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ باطنی راہ نمائی کے لیے ایک ستارہ بھی آسمان روحانیت پر روشن نہ کیا ہو۔

بے شک روحانی طور پر بھی بہت دفعہ ایک زندہ قوم سے مردہ اور مردہ سے زندہ افراد پیدا کرتا ہے اور جس طرح اس نے ہماری دنیوی زندگی کے مستقر و مستودع کا حکیمانہ بندوبست کیا ہے، حیات اخروی کے مستقر اور مستودع کے سامان بھی اس سے کہیں بڑھ کر مہیا فرمائے۔ یہیں یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ جس طرح ہم خدا تعالیٰ کو اس کے کاموں سے پہچانتے ہیں، یعنی جو کام وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کرتا ہے کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ ویسا کام کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح خدا کا کلام وہی ہو سکتا ہے کہ جیسا کلام ساری مخلوق مل کر بھی نہ بنا سکے۔

(تفسیر عثمانی ص ۱۸۷)

تیسرے نمبر پر علامہ نے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۴۵ اور ۴۶ کا حوالہ دیا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ
سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَيْهِ دَلِيلًا (۴۵) ۚ ثُمَّ قَبَضْنَا
إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا (۴۶)

ترجمہ: بل کہ تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کر (کے پھیلا) دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا پھر سورج کا اس کا راہ نما بنا دیتا ہے پھر ہم اس کو آہستہ

آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ (۲۵-۲۶، ۲۵)

۱۔ ”اے مخاطب کیا تو نے اپنے پروردگار کی قدرت و صنعت پر نظر نہیں کیا کہ وہ صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے مشرق سے مغرب تک کس طرح سایہ کو پھیلاتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس سایہ کو ہمیشہ ایک حالت پر ٹھہرایا ہوا رکھتا کہ آفتاب کی بلندی کا بھی کچھ اثر نہ پڑتا، پھر ہم نے آفتاب کو اس کے سایہ کی درازی و کوتاہی پر ایک ظاہری علامت مقرر کر دیا کہ جہاں سورج ہوتا ہے سایہ فوراً اس کے ساتھ ہوتا ہے پھر ہم نے اس سایہ کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیا۔“ (تفسیر ابن عباس۔ جلد دوم، ص ۳۸۷)

۲۔ صبح سے طلوع شمس تک سب جگہ سایہ رہتا ہے، اگر حق تعالیٰ سورج کو طلوع نہ ہونے دیتا تو یہی سایہ قائم رہتا، مگر اس نے اپنی قدرت سے سورج کو نکالا جس سے دھوپ پھیلنی شروع ہوتی ہے اور سایہ بہ تدریج ایک طرف کو سمٹنے لگا، اگر دھوپ نہ آتی تو سایہ کو ہم سمجھ ہی نہ سکتے کیوں کہ ایک ضد آنے سے دوسری ضد پہچانی جاتی ہے۔۔۔۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اول ہر چیز کا سایہ لمبا پڑتا ہے پھر جس طرف سورج چلتا ہے اس کے مقابل سایہ ہٹتا جاتا ہے جب تک جڑ میں آگے۔ اپنی طرف کھینچ لیا کا مطلب ہے اپنی اصل کو جا لگتا ہے سب کی اصل اللہ ہے۔۔۔ (تفسیر عثمانی، ص ۲۸۵)

چوتھی سورہ الغاشیہ کی آیات ۱۷ تا ۲۰ ہیں جن کا حوالہ علامہ نے دیا ہے :

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۱۷) دقفہ وَإِلَى

السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۱۸) دقفہ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ

(۱۹) دقفہ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۲۰)

ترجمہ: یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

(۸۸-۲۰ تا ۱۷)

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے (اس سورت میں بیان کی گئی) یہ چیزیں بیان کیں تو مکہ والے بولے کہ اپنی رسالت پر کوئی دلیل پیش کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مکہ والو اونٹ کی ساخت اور اس کی شدت اور قوت کو نہیں دیکھتے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ تمام مخلوق پر کس طرح بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ کس طرح انہیں زمین میں قائم کیا گیا ہے کہ کوئی چیز بھی انہیں حرکت نہیں دے سکتی اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پانی پر بچھالی گئی ہے یہ سب نشانیاں ہیں۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد سوم، ص ۴۷۰)

اس کے بعد سورہ روم کی آیت نمبر ۲۱ درج کی گئی ہے :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا
إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ
لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۲۱)

اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی نشانیاں ہیں)۔ (۲۱-۳۰)

یعنی اول مٹی سے ایک آدم کو پیدا کیا پھر اس کے اندر سے ایک جوڑا نکالاتا کہ اس سے انس اور چین پکڑے اور پیدائشی طور پر دونوں صنفوں (مرد و عورت) کے درمیان خاص قسم کی محبت اور پیار رکھ دیا تا مقصود ازدواج حاصل ہو چنانچہ دونوں کے میل جول سے نسل انسانی دنیا میں پھیل گئی۔ (تفسیر عثمانی، ص ۵۲۱)

قرآن پاک کی مختلف سورتوں سے گیارہ آیات پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ قرآن مشاہدے اور اپنے ارد گرد موجود عالم پر غور و فکر کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ یہ آیات پیش کرنے کے بعد علامہ کہتے ہیں :

”اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک نے فطرت کے مشاہدے میں غورو فکر کی ترغیب دلائی تو اس لیے کہ ہم اس حقیقت کا شعور پیدا کریں جس

کی عالمِ فطرت کو اس نے ایک آیت ٹھہرایا ہے، لیکن یہاں توجہ طلب امر قرآن مجید کی وہ اختباری (یعنی حواس سے کام لیتے ہوئے مظاہر و موجوداتِ عالم کے مطالعے اور مشاہدے) روش ہے جس سے مسلمانوں کے اندر عالمِ واقعیت کا احترام پیدا ہوا اور جس کی بدولت آگے چل کر انھوں نے علومِ جدیدہ کی بنیاد ڈالی۔“ (تشکیلِ جدیدہ ص ۲۱)

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:

”جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اتنا بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذاتِ الہیہ کے ادراک میں بنی نوع نے سب سے پہلے مذہبی مشاہدات کا محسوسات و مدرکات کے دوسرے عوامل کی طرف بعد میں قدم بڑھایا۔ قرآن مجید نے انسان کی اختباری روش کو اس کی روحانی زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ٹھہرایا اور اس لیے محسوسات و مدرکات کے ہر عالم کو یکساں اہمیت دی کیوں کہ وہ حقیقتِ مطلقہ کے علم و ادراک کا جس کی آیاتِ ظاہر و باطن ہر کہیں موجود ہیں ایک ذریعہ ہیں۔“ (تشکیلِ جدیدہ ص ۲۲)

اس موضوع پر قرآن پاک میں متعدد آیات موجود ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳)
۱۔ ہم عن قریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے، کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے (۲۱-۵۳)

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (۲۰) ۚ وَفِي أَنْفُسِكُمْ ۗ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۲۱)

۲۔ اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں، خود تمہارے نفوس میں۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔ (۲۱، ۲۰-۵۱)

ادراک بالحواس کے ساتھ قلب کی اہمیت

”قرآن پاک کی فطرت پسندی محض اس امر کا اعتراف ہے کہ انسان فطرت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی چوں کہ امکانی ذریعہ ہے تو اے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کا اس لیے ہمیں چاہیے اس کا استعمال بے روح تغلب کے بجائے اس مقصد عظیم کے لیے کریں کہ ہمیں اپنی روحانی زندگی میں آزادی کے ساتھ مدارج کمال کی طرف بڑھنا ہے، یہی وجہ ہے کہ حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال لقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے فواید قلب سے تعبیر کیا ہے۔“ (تشکیل جدید - ص ۲۳)

اس عبارت کے حوالے سے علامہ نے قرآن پاک کی سورت ح م السجدہ کی آیات ۹، ۸، ۷ پیش کی ہیں :

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۷) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ
(۸) ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَ الْأَبْصَارَ وَ الْآفِئِدَةَ ط قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۹)

ترجمہ: جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر اس کی نسل خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی پھر اس کو درست کیا، پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے (مگر) تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

(۳۲ - ۹، ۸، ۷)

ان آیات کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں، یہ ایک لطیف انداز بیان ہے روح پھونکنے سے پہلے انسان کا سارا ذرہ صیغہ واحد میں کیا جاتا رہا، اس کی تخلیق کی اس کی نسل چلائی اس کو تک سب درست کیا، اس کے اندر روح پھونکی اس لیے کہ اس وقت تک وہ خطاب کے

لائق نہ تھا، پھر جب روح پھونک دی گئی تو اب فرمایا جا رہا ہے کہ تم کو کان دیئے تم کو آنکھیں دیں، تم کو دل دیے اس لیے کہ حامل روح ہو جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اسے مخاطب کیا جائے۔

کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے، اگرچہ حصول علم کے ذرائع ذائقہ، لامسہ اور شامعہ بھی ہیں، لیکن سماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے زیادہ بڑے اور اہم ہیں اس لیے قرآن جگہ جگہ انھی دو کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اس کے بعد دل سے مراد وہ ذہن (mind) ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات مرتب کر کے نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانات میں سے کوئی ایک راہ منتخب کرنا اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔“ (تفہیم القرآن، جلد چہارم۔ ص۔ ۴۲، ۴۳)

قلب کو قوت دید حاصل ہے

”قلب کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولانا روم کے دل کش الفاظ میں نورِ آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقت مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماورا ہیں۔ قرآن مجید کے نزدیک قلب کو قوت دید حاصل ہے اور اس کی اطلاعات، بشرطیکہ ان کی تعبیر صحت کے ساتھ کی جائے کبھی غلط نہیں ہوتیں۔“ (تشکیل جدید ص ۲۳)

اس حوالے سے ایم سعید شیخ نے قرآن پاک کی ایک آیت کا حوالہ دیا ہے :

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى (۱۱) اَفْتَرُونَهُ عَلٰی مَا

يَذَى (۱۲)

ترجمہ: جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے جھوٹ نہ جانا، کیا جو کچھ وہ

دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو۔ (۱۲:۱۱-۵۳)

یہاں آگے بڑھتے ہوئے ایک اور آیت کا حوالہ دیا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں

کہ وہ کوئی پُر اسرار قوت ہے اسے دراصل حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا وہ طریق ٹھہرانا چاہیے جس میں بہ اعتبار عضویات حواس کا مطلق دخل نہیں ہوتا۔ (تشکیل ص ۲۳) اس موقع پر انگریزی خطبات میں سورہ الحج کی آیت نمبر ۲۶ کا حوالہ دیا گیا۔ (لیکن بہ ظاہر وہ اس سے متعلق نظر نہیں آتی)

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا
أَوْ أذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى
الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۴۶)

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے ملک کی سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے ہوتے) کہ ان کو سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے، بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بل کہ دل جو سینوں میں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

(۲۲-۲۶)

واردات تصوف۔ خدا کی ہستی کا ثبوت۔ اس کا جواب

فواد یا قلب کی بحث میں علامہ نے صوفیانہ احوال و واردات کو موضوع بنایا ہے اور صوفیانہ واردات اور مراتب کو طبعی احوال کی طرح حقیقی قرار دیا ہے۔

”اس امر کا بھی کوئی جواز نہیں کہ ہم اپنے محسوسات و مدركات طبعی مرتبے کو تو حقیقی لیکن باقی مراتب کو صوفیانہ یا جذباتی ٹھہرا کر ناقابل اعتنا قرار دیں۔ مذہبی مشاہدات کے حقائق بھی ویسے ہی حقائق ہیں جیسے ہمارے مشاہدات کے حقائق اور جہاں تک کسی حقیقت کی تعبیر سے حصول علم کا امکان ہے ہمارے لیے سب حقائق یکساں طور پر اہم ہیں۔“

(تشکیل جدید۔ ص ۲۳)

علامہ نے اس موقع پر ابن صیاد کے حوالے سے احادیث میں بیان کردہ واقعے کا بھی تجزیہ کیا ہے اور پھر صوفیانہ مشاہدات کی چند خصوصیات بیان کی ہیں۔ صوفیانہ مشاہدات میں حضوریت

ہے اور یہ ناقابل تجزیہ کلیت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ صوفی کا حال کسی برتر و یکتا ہستی کے ساتھ اتحاد کا ایک لمحہ ہوتا ہے اور خدا کی ہستی کے وجود کے بارے میں صوفیانہ تجربے کے حوالے سے علامہ فرماتے ہیں :

”جواب ہی بلاشبہ کسی صاحب شعور ہستی کی موجودگی کا ثبوت ہے اور قرآن پاک کا بھی یہی ارشاد ہے“ (تشکیلِ جدید۔ ص۔ ۲۹۔)

یہاں علامہ نے سورہ مومن کی آیت نمبر ۶۰ کا ایک حصہ اور پھر سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کا ایک حصہ پیش کیا ہے۔ پوری آیات کا ترجمہ یوں ہے :

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (۶۰) ۴

ترجمہ : اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے ازراہ تکبر کنیا تے ہیں عن قریب جہنم میں ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوں گے۔ (۶۰۔۴۰)

دوسری آیت سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۸۶ ہے :

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۗ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۗ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۱۸۶)

ترجمہ : اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہ دو) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستہ پائیں۔ (۱۸۶:۲)

پہلی یعنی سورہ مومن کی آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں :

۱۔ یعنی دعائیں قبول کرنے یا نہ کرنے کے جملہ اختیارات میرے پاس ہیں لہذا تم

دوسروں سے دعائیں نہ مانگو بل کہ مجھ سے مانگو، اس آیت کی روح کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیں۔

اول یہ کہ دعا آدمی صرف اسی ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع و بصیر اور فوق الفطری اقتدار کا مالک سمجھتا ہے اور دعا مانگنے کا محرک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت فطری ذرائع اور وسائل اس کی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے اس لیے فوق الفطری اقتدار کی مالک کسی ہستی سے رجوع ناگزیر ہے۔ دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے اس سے لازم نہیں آجاتا کہ فی الواقع اختیارات کی مالک ہو جائے۔ مالک اختیارات ہونا تو امر واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے مالک رہے گا، خواہ آپ مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے مانگنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوان حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکم ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہیں انھی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں۔ ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مجھے پکارو، تمہاری دعاؤں کا جواب دینے والا ہوں انھیں قبول کرنا میرا کام ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم، ص ۴۲۱)

سورہ البقرہ کی آیت ۱۸۶ کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

۱۔ آپ سے بعض نے پوچھا کہ ہمارا رب دہر ہے تو ہم اس کو پکاریں یا نزدیک ہے تو آہستہ بات کریں، اس پر یہ آیت اتری یعنی وہ قریب ہے ہر ایک کی بات سنتا ہے آہستہ ہو یا پکار کر۔۔۔۔۔ (تفسیر عثمانی، ص ۳۶)

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہے۔ درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر فرما کا اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے۔

۲۔ اور ان حالات میں بندوں کو بھی چاہیے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا اور امام ابن کثیر نے اس درمیانی جملہ ترغیب دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ (معارف القرآن۔ جلد اول۔ ص۔ ۳۹۵)

صوفیانہ (روحانی) تجربہ کی تعبیر

”بہ اعتبار نوعیت صوفیانہ مشاہدات چوں کہ براہ راست ہی تجربے میں آتے ہیں لہذا ان مشاہدات کو دوسروں تک جوں کا توں پہنچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ فکر کے بجائے زیادہ تر احساس کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ لہذا صوفی یا پیغمبر جب اپنی مذہبی شعور کی تعبیر الفاظ میں کرتا ہے تو اسے منطقی قضایا ہی کی شکل دے سکتا ہے، یہ نہیں کہ اس کا مشمول من و عن دوسروں تک منتقل کر سکے۔ چنانچہ ذیل کی آیات میں بھی جس حقیقت کا بیان مقصود ہے وہ ان مشاہدات کی نفسیات ہے نہ کہ ان کا مشمول۔“

(تشکیل جدید۔ ص۔ ۳۰)

علامہ اقبال نے اس عبارت کے بعد جو آیات پیش کی ہیں وہ سورہ الشعرا کی آیت نمبر ۵۱۔ اور سورہ وانجم کی آیات ۱ تا ۱۸ ہیں۔

سورہ الشعرا کی آیت :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۵۱)

ترجمہ: اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام
(کے ذریعے) یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم
سے جو چاہے القا کرے، بے شک وہ عالی رتبہ (اور) حکمت والا ہے۔

(۴۲-۵۱)

تفسیر: اور کسی آدمی کی یہ شان نہیں کہ رو برو ہو کر اللہ تعالیٰ سے کلام فرمائے مگر یہ تو
الہام سے خواہ خواب میں ہو یا پردے کے باہر سے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کلام فرمایا تھا یا کسی
فرشتے کو بھیج دے وہ اللہ کے حکم سے جو امر وہی ہوتا ہے وہ پیغام پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جبریل امین کو بھیجا وہ بڑا عالی شان اور اپنے حکم، فیصلہ میں
حکمت والا ہے۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد سوم۔ ص۔ ۲۰۳)

تفسیر: کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قوی کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں
رکھتا کہ خداوند قدوس اس دنیا میں اس کے سامنے ہو کر مشافہتہ کلام فرمائے اور وہ اس کا تحمل کر
سکے۔ اس لیے کسی بشر سے اس کے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں (الف) بلا واسطہ پردہ
کے پیچھے سے کلام فرمائے، یعنی نبی کی قوت سامعہ استماع کلام سے لذت اندوز ہو مگر اس
حالت میں آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہ ہو سکیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اور
خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں پیش آیا۔ (ب) بہ واسطہ فرشتہ کے حق تعالیٰ کلام
فرمائے مگر فرشتہ مجتہد ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے بل کہ براہ راست نبی کے قلب پر نزول
کرے اور قلب ہی سے ادراک فرشتہ کا اور صورت کا ہوتا ہو۔ جو اس ظاہرہ کو چنداں دخل نہ
رہے..... (ج) تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ مجتہد ہو کر نبی کے سامنے آجائے اور اس طرح
خدا کا کلام و پیام پہنچا دے جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے، چنانچہ جبریل ایک
دو مرتبہ اپنی اصلی صورت میں حضور کے پاس آئے..... (تفسیر عثمانی۔ ص ۶۵۰)

سورہ والنجم کی آیات کا ترجمہ :

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ (۱) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (۲)

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (۳) إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۴)
 عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ (۵) ذُو مِرَّةٍ ط فَاسْتَوَىٰ (۶) وَهُوَ بِالْأُ
 فُقِ الْأَعْلَىٰ (۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ (۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ
 أَدْنَىٰ (۹) فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (۱۰) مَا كَذَبَ
 الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (۱۱) أَفَتُبْرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (۱۲) وَلَقَدْ
 رَأَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (۱۳) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ (۱۴) عِنْدَهَا
 جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ (۱۵) إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ (۱۶) مَا
 زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ (۱۷) لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ
 الْكُبْرَىٰ (۱۸)

تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے کہ تمہارے رفیق (صلی اللہ علیہ وآلہ
 وسلم) نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات
 نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے
 ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا (یعنی جبرائیل طاقت ور) پھر وہ یوں نظر
 آئے اور وہ (آسمان کے) اونچے کنارے میں تھے پھر وہ قریب ہوئے اور
 آگے بڑھے تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم، پھر خدا نے اپنے
 بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا، جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے
 اس کو جھوٹ نہ جانا، کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو
 اور انہوں نے اس کو ایک اور بار دیکھا ہے میرے حد کی بیری کے پاس، اس
 کے پاس رہنے کی بہشت ہے جب کہ اس بیری پر چھارہا تھا جو چھارہا تھا،
 ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) بڑھی انہوں نے پروردگار
 (قدرت کی) بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ (۵۳-۱۸۲۱-)

یہ بیان ہے ان مشاہدات کا جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئے فرمایا کہ اس نے
 اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانوں کا مشاہدہ کیا ان نشانیوں کی تفصیل نہیں فرمائی کہ نہ الفاظ

ان کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ وہ ہماری عقل کی گرفت میں آسکتیں، تاہم لفظ کبریٰ دلیل ہے کہ یہ نشانیاں ان نشانیوں سے بالاتر نہیں جن کا مشاہدہ نفس و آفاق میں ہر قدم پر ہر صاحب نظر کو ہوتا رہتا ہے۔ مفسرین نے ان سے وہ مشاہدات مراد لیے ہیں جو حضور کو معراج کے موقع پر ہوئے ان کی اس رائے کے حق میں یہ قرینہ موجود ہے کہ سورہ اسراء میں ذکر ہے کہ اس موقع پر آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے، تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ آپ کو مشاہدہ صرف اپنے رب کی نشانیوں ہی کا ہوا، خود خدا تعالیٰ کے مشاہدے کا یہاں کوئی اشارہ نہیں۔ (تدبر قرآن۔ جلد ششم۔ ص ۵۷)

وارداتِ تصوف اور شیطانی افترا

علامہ نے صوفیانہ احوال و واردات کی علمی حیثیت پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کے نزدیک یہ بھی اپنی جگہ حقیقت رکھتی ہیں اور ہم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ تاہم صوفیانہ واردات شیطانی افترا میں فرق رکھنا ضروری ہے بالخصوص عیسوی تصوف کو ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا ہے۔

”جہاں تک حصول علم کا تعلق ہے صوفیانہ مشاہدات کی دنیا ایسی ہی حقیقی اور معتبر ہے جیسے ہمارے مشاہدات کا کوئی اور عالم، لہذا ان کو محض اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان مشاہدات کی ابتدا ادراک بالحواس سے نہیں ہوتی۔“
(تشکیل جدید۔ ص ۳۲)

”تاریخ میں یہ عقده لاینحل رہا ہے کہ ہم ان واردات اور ان پیغامات کو جن کی حیثیت خدائی معجزات کی تھی، ان واردات اور مشاہدات سے کس طرح الگ کریں جن کو شیطان محض عداوت کی بنا پر افترا کر لیتا ہے کہ طالب حق کو دوگونہ جہنم کا مستحق ٹھہرائے، اس کے لیے ہادیان نوع انسانی کو ساری فراست، بصیرت اور دانائی سے کام لینا پڑا، مگر فیصلہ ہوا تو آخر الامر ہمارے اختیاری معیار ہی کی بدولت اور وہ یوں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا

ہے نہ کہ جڑ سے۔ دراصل مسیحی تصوف کا مسئلہ جس کی طرف پروفیسر ولیم جیمز نے اشارہ کیا ہے سارے تصوف کا مسئلہ ہے۔ شیطان واقعی اپنی عداوت میں ایسی واردات افترا کر لیتا ہے جو صوفیانہ مشاہدات کے حلقے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ (تشکیل جدید ص ۳۵)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى
الْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ۗ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ
ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَتَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۵۲)

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ ڈال دیتا تھا تو جو) (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے، پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا علم والا اور حکمت والا ہے۔ (۲۲-۵۲)

اس آیت کے حوالے سے مفسرین میں اختلاف ہے۔ حضرت سعید بن جبیر کی روایت بیان کی گئی ہے جس میں قصہ غرائق بیان کیا گیا ہے بیش تر مفسرین کے نزدیک یہ قصہ درست نہیں ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں ان تمام تفصیلات سے بحث کرتے ہیں اور اپنی تفسیر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

احقر کے نزدیک بہترین اور سہل ترین تفسیر وہ ہے جس کی مختصر اصل سلف سے منقول ہے، یعنی تمنیٰ کو بمعنی قرات و تلاوت یا تحدیث اور انیت کو بمعنی متلو یا حدیث لیا جائے، مطلب یہ کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا یا اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے شیطان اس بیان کی ہوئی بات یا آیت میں طرح طرح کے شبہات ڈال دیتا ہے، یعنی بعض باتوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے شکوک شبہات پیدا کر دیتا ہے۔

اس القا شیطانی کے ابطال و رد میں پیغمبر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی کچی باتیں بتلاتے ہیں جن کو سن کر شک و شبہ کی قطعاً

گنجائش نہ رہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۳۵۰)

یہاں ہدایت و اصلاح کی راہ میں نبی کے اقدام کو تمنیٰ اور اس کی سعی و جدوجہد کو امنیۃ سے تعبیر فرمایا ہے ”امنیۃ“ معنی آرزو، حوصلہ اور ارمان کے ہیں، ان الفاظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کی تمنا اور آرزو تو روز و شب یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی ہدایت اور اس کی باتیں (آیات) اُتارنے کی کوئی راہ کھلے اور وہ یہ راہ کھولنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا رہتا ہے لیکن شیاطین ہر وقت یہ راہ مارنے کے لیے گھات میں رہتے ہیں۔

(مدبر قرآن۔ جلد پنجم۔ ص ۲۶۹)



مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار

The Philosophical Test of the Revelation of Religious Experience

اس خطبے کی ابتدا میں علامہ نے وجودِ باری تعالیٰ پر متکلمین کی تین دلیلوں یعنی کوئی، غائی اور وجودی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ تینوں دلیلیں علامہ کے نزدیک نقص سے خالی نہیں ہیں تینوں دلیلوں سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ عقلِ انسانی نے ذاتِ مطلق کی جستجو کے لیے حقیقی طور پر تحریک کی لیکن منطقی اعتبار سے تینوں ناقص ہیں۔ گویا عقل نے ان کے لیے جو اساس قائم کی ہے وہ عقل ہی کے اوزاروں سے منہدم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد علامہ نے محسوسات و مدرکات کے تین مراتب یعنی مادہ، حیات اور شعور پر بحث کے لیے طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات ایسے علوم کے نتائج فکر پر بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ سائنس کے ہاں حقیقت کا کوئی مبسوط نظریہ نہیں۔ ان تصورات میں بھی کوئی ایسا ربط نہیں کہ انہیں آپس میں جوڑ کر حقیقت کی شکل کا سراغ لگایا جاسکے۔

قرآن کی تعلیمات کے مطابق خدا، کائنات اور حیات متحرک ہیں۔ اس لیے علامہ کے ہاں زمان کی ماہیت کا مسئلہ بہت اہم ہے آئن سٹائن کے نزدیک چوں کہ کائنات متحرک ہے اس لیے مکان کے صحیح جائے وقوع کے تعین کے لیے پیمائشِ زمان ضروری ہو جاتی ہے۔ اور یوں زمان، مکان کا چوتھا بعد بن جاتا ہے، نظریہ اضافیت کے تحت مکان کا وجود ناظر کے لیے اضافی ہے۔ علامہ کا اضافیت پر اعتراض یہ ہے کہ یوں زمان کا وجود غیر حقیقی ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل کا وجود بھی پہلے سے متعین ہے۔

برگساں کے تصور کے مطابق انسانی شعور ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور ذہنی کیفیات کے پیہم رد و بدل سے ہم بدلتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی شعور کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور فعال جس کا تعلق گرد و پیش، روزمرہ کی عملی زندگی سے ہے، برگساں کی نظر میں زمان کا یہ تصور حقیقی زمان نہیں۔ دوسرا پہلو داخلی ہے جس کا تعلق انسان کے گہرے غور و فکر کے لمحات سے ہے۔ اس کیفیت میں زمان محض ایک آن یا مستقل حال ہے۔ اور یہی برگساں کے نزدیک زمان خالص یا زمان حقیقی ہے۔ علامہ کے نزدیک قرآن حکیم کی رو سے خدا کا تخلیقی عمل بھی ایسا ہی تیز ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا، پس خدا کا زمان، زمان خالص ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے تخلیقی عمل سے زمان متسلسل لحظہ بہ لحظہ تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات خلا میں اشیا کے مجموعے کا نام نہیں بل کہ ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے۔

زندگی پے در پے تبدیلی اور کار فرمائی سے اغراض و مقاصد کی تشکیل کرتی ہے اور جوں جوں اس کا عمل بڑھتا ہے نئے نئے عزم وضع ہوتے ہیں۔ اس تسلسل میں ہم جو کچھ ہیں وہ نہیں رہتے زندگی کا رستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس رستہ کا تسلسل بے قاعدہ ہے۔ حیات و کائنات کا عمل زمان کے تسلسل میں اس لحاظ سے مقصد سے خالی ہے کہ وہ پہلے سے کسی متعین منزل کی طرف نہیں بڑھ رہا، پس زمان کی حرکت کسی پہلے سے کچھ ہوئے خط کی شکل میں نہیں، یہ خط ابھی کھینچ رہا ہے اور اس سے مراد وہ امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں۔ اقبال کے نزدیک مستقبل انھی معنوں میں با مقصد ہے اور وہ قرآنی اصطلاح تقدیر کی تشریح بھی اسی انداز میں کرتے ہیں۔

آخر میں اقبال فرماتے ہیں کہ صرف وجدان کے ذریعہ یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ حیات دراصل ایک اپنی ذات پر مرکب خودی ہے۔ ایسے علم کو خواہ نامکمل قرار دیا جائے پھر بھی وہ ایک نقطہ آغاز ہے جس کی بدولت انسان پر بلا واسطہ انکشاف ہوتا ہے کہ حقیقت مطلق کی ماہیت کیا ہے؟ حقیقت مطلق کا تصور ایک خودی کے طور پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے

نزدیک مذہب کے عزائم فلسفہ سے بلند تر ہیں۔ فلسفہ دُور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے برعکس مذہب حقیقت سے قرب و اتصال کا آرزو مند ہے، ایک صرف مفروضہ ہے اور دوسرا تقرب و اتصال کا زندہ تجربہ۔ عقل کے لیے ایسا تقرب تب ہی ممکن ہے کہ وہ اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے اور تکمیل آرزو کی خاطر ایسی ذہنی روش اختیار کرے جسے مذہب دعا سے تعبیر کرتا ہے (ملخص از۔ زندہ رود۔ جلد سوم۔ ص ۳۷۴-۳۷۵)۔

وجودِ باری تعالیٰ کی تینوں دلیلوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد علامہ لکھتے ہیں:

”لہذا دلیل وجودی اور غائی میں کوئی معنی پیدا ہوں گے تو صرف اس صورت میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ ہم اپنے ارتقا کی جس منزل میں ہیں وہ ہماری آخری منزل نہیں۔ علیٰ ہذا یہ کہ فکر اور ”وجود“ اپنی کہنہ میں ایک ہیں، لیکن یہ جب ہی ممکن ہے جب ہم اپنے محسوسات و مدارکات کی تعبیر قرآن پاک کی راہ نمائی میں کریں جس نے ان کو حقیقت کی آیات ٹھہرایا، جو اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ چنانچہ اس خطبے میں یہی امر ہمارے پیش نظر ہے۔“ (تشکیلِ جدید۔ ص ۴۷)

علامہ نے یہاں قرآن مجید کی سورہ الحدید کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس کا ترجمہ اس طرح ہے۔ (اس کا حوالہ سید نذیر نیازی نے حاشیے میں دیا ہے) تاہم اسی عبارت کے حوالے سے ایم سعید شیخ نے اس سے قبل دو اور آیات کا حوالہ بھی دیا ہے جن کا ترجمہ پہلے دیا جاتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ اَيَّتَنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ
الْحَقُّ ۗ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳)

۱۔ ہم عن قریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے، کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے (۴۱-۵۳)

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلسُّوْقِنِيْنَ (۲۰) ۗ وَفِي اَنْفُسِكُمْ ۗ اَفَلَا
تُبْصِرُوْنَ (۲۱)

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور خود

تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔ (۵۱-۲۰، ۲۱)

اس کے بعد سورہ حدید کی آیت نمبر ۳ کا ترجمہ پیش ہے :

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ (۳)

ترجمہ: وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے
سب پر) ظاہر اور (اپنی ذات) سے پوشیدہ ہے اور تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

(۳-۵۷)

تفسیر: ہر چیز کا وجود ظہور اس کے وجود سے ہے، لہذا اس کا وجود اگر ظاہر و باہر نہ ہو

گا تو اور کس کا ہوگا۔ عرش سے فرش تک ذرہ سے آفتاب تک ہر چیز کی ہستی اس کی ہستی کی روشن
دلیل ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کی کہنہ اور حقائق صفات تک عقل و ادراک کی رسائی نہیں۔ کسی
ایک صفت کا احاطہ بھی کوئی نہیں کر سکتا نہ اپنے قیاس و رائے سے اس کی کچھ کیفیت بیان کر سکتا
ہے، بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ باطن اور پوشیدہ کوئی نہیں۔ بہر حال وہ اندر بھی ہے
باہر بھی ظاہر بھی باطن بھی، کھلے اور چھپے ہر قسم کے احوال جاننے والا ہے۔ ظاہر (بہ معنی غالب)
ایسا کہ اس سے اوپر قوت کوئی نہیں، باطن ایسا کہ اس سے پرے کوئی موقع نہیں جہاں اس کی
آنکھ سے اوچھل ہو کر پناہ مل سکے (تفسیر عثمانی، ص ۷۱۳)

۲۔ یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ تھا اور جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا، وہ سب

ظاہروں سے بڑھ کر ظاہر ہے کیوں کہ دنیا میں جو بھی ظہور ہے اسی کی صفات اور اسی کے افعال
اور اسی کے نور کا ظہور ہے اور وہ ہر مخفی سے بڑھ کر مخفی ہے، کیوں کہ حواس سے اس کی ذات کو
محسوس کرنا تو درکنار، عقل و فکر و خیال تک اس کی کہنہ و حقیقت کو نہیں پاسکتے۔ (تفہیم القرآن۔
جلد پنجم۔ ص ۳۰۳۔)

خطبے میں آگے چل کر علامہ نے مادہ، حیات، نفس اور شعور کے حوالے سے تین علوم

طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کا ایک جائزہ پیش کیا، طبیعیات میں نئے تصورات مادے کے

بارے میں نئے نظریات، بالخصوص آئین شائین کے نظریہ اضافیت کو موضوع بنایا ہے اور اسی

حوالے سے زمان و مکاں کے تصورات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں :

”علوم طبعی یا سائنس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ جزئی ہو اس لیے کہ بہ اعتبار اپنی

ماہیت اور وظیفے کے اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ کوئی واحد اور کامل و مکمل

نظریہ قائم کر سکے۔“ (تشکیل جدید۔ ص۔ ۶۵)

روانی اور تسلسل، کائنات کی اہم حقیقت

”ہمیں معلوم ہے کہ پروفیسر وائیٹ ہیڈ کے نزدیک کائنات کوئی ساکن

وجود نہیں، بل کہ حوادث کی ترکیب جس کی نوعیت ایک مسلسل اور تخلیقی روانی

کی ہے۔ عالم فطرت کی یہی خصوصیت یعنی مرور فی الزمان ہمارے

محسوسات و مدارکات کا وہ سب سے معنی خیز پہلو ہے جس پر قرآن مجید نے

بالخصوص زور دیا ہے اور پھر جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے، ہمارے

ز نزدیک حقیقت مطلقہ کے ادراک کا بہترین ذریعہ۔ اس سلسلے میں بعض

آیات کی طرف ہم پہلے (یعنی خطبہ اول میں) اشارہ کر آئے ہیں۔ لیکن

مسئلہ زیر بحث کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہاں چند ایک اور آیات پیش کر دی

جائیں۔“ (تشکیل جدید، ص۔ ۷۰)

یہاں علامہ نے چار مختلف مقامات سے آیتیں پیش کی ہیں۔

سب سے پہلے سورہ یونس کی آیت نمبر ۶

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ (۶)

ترجمہ: رات اور دن کے (ایک دوسرے کے پیچھے) آنے جانے میں اور جو

چیز خدا نے آسمان اور زمین میں پیدا کی ہے (سب میں) ڈرنے والوں کے

لیے نشانیاں ہیں۔ (۱۰-۶)

تفسیر: کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جو کام ہر طرف نظر آ رہے ہیں جن کے بڑے

بڑے نشانات سورج اور چاند اور لیل و نہار کی صورت میں ہر شخص کے سامنے موجود ہیں ان سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس عظیم الشان کارگاہ ہستی کا خالق کوئی بچہ نہیں جس نے محض کھیلنے کے لیے یہ سب کچھ بنایا ہو اور پھر دل بھر لینے کے بعد یوں ہی اس گھر و ندے کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ صریح طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس کام میں نظم ہے، حکمت ہے مصلحتیں ہیں اور ذرے ذرے کی پیدائش میں ایک گہری مقصدیت پائی جاتی ہے پس جب وہ حکیم ہے اور اس کی حکمت کے آثار و علامت تمہارے سامنے اعلانیہ موجود ہیں تو اس سے تم کیسے توقع رکھ سکتے ہو کہ وہ انسان کو عقل اور اخلاقی حس اور آزادانہ ذمہ داری اور تصرف کے اختیارات بخشنے کے بعد اس کا رنامہ زندگی کا حساب نہ رکھے گا۔

..... اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے زندگی کے مظاہر میں ہر طرف وہ آثار پھیلا رکھے ہیں جو مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کی صاف صاف نشان دہی کر رہے ہیں، لیکن ان نشانات تک صرف وہی لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ دو صفات موجود ہوں، ایک یہ کہ وہ جاہلانہ تعصبات سے پاک ہو کر علم حاصل کرنے کے ان ذرائع سے کام لیں جو اللہ نے انسان کو دیے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے اندر خود یہ خواہش موجود ہو کہ غلطی سے بچیں اور صحیح راستہ اختیار کریں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ ص ۶۶-۶۷)

علامہ نے دوسری آیت سورہ فرقان سے دی ہے، جو اس سورہ کی آیت نمبر ۶۲ ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّبَنٍ اَرَادَ اَنْ يَّذْكَرَ
اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۶۲)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے

جانے والا بنایا (یہ باتیں) اس شخص کے لیے جو غور کرنا چاہے یا شکر گزاری کا

ارادہ کرے (سوچنے، سمجھنے کی ہیں) (۶۲-۲۵)

تفسیر: یعنی چاند سورج وغیرہ کا الٹ پھیر اور رات دن کا ادل بدل اس لیے ہے کہ

اس میں دھیان کر کے لوگ خداوند قدیر کی معرفت کا سراغ لگائیں کہ یہ سب تصرفات و تقلبات

عظیمہ اس کی دستِ قدرت کی کارسازیاں ہیں۔ اور رات دن کے فوائد و انعامات کو دیکھ کر اس کی شکرگزاری کی طرف متوجہ ہوں۔ (تفسیر عثمانی، ص ۲۸۷)

تیسری آیت سورہ لقمان کی آیت نمبر ۲۹ ہے :

الْمَ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي
الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ
مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۹)

ترجمہ: کیا تم نے دیکھا نہیں کہ خدا ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور وہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو (تمہارے) زیر فرمان کر رکھا ہے ہر ایک وقت مقررہ تک چل رہا ہے اور یہ کہ خدا تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔ (۲۹:۳۱)

تفسیر: یعنی رات اور دن کا پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آنا خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سورج اور چاند پوری طرح ایک ضابطہ میں کسے ہوئے، سورج اور چاند کا ذکر یہاں محض اس لیے کیا گیا ہے کہ دونوں عالمِ بالا کی وہ نمایاں ترین چیزیں ہیں جن کو انسان قدیم زمانے سے معبود بنا تا چلا آ رہا ہے اور آج بھی انسان انھیں دیوتا مان رہے ہیں ورنہ درحقیقت زمین، کائنات کے تمام تاروں سیاروں کو اللہ تعالیٰ نے اٹل ضابطے میں کس رکھا ہے جس سے سرمو ہٹ نہیں سکتے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ ص ۲۴۔)

اس مضمون کی چوتھی آیت سورہ زمر کی آیت نمبر ۵ ہے، جس کا ایک حصہ یہاں شامل ہے۔ تشکیل جدید میں اس کا حوالہ بالکل ہی مختلف دیا گیا ہے۔ یہاں بہ ظاہر دو آیات کو ملا دیا گیا ہے اور حوالہ ۲۳-۸۲ دیا گیا ہے جب کہ اس میں پہلے حصے کا حوالہ ۳۹-۵ ہے جب کہ دوسرے حصے کا ۲۳-۸۰ ہے۔ پہلے کا ترجمہ یہ ہے :

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ
وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ
يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ (۵)

ترجمہ: اسی نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے (اور) وہی رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو بس میں کر رکھا ہے سب ایک مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے اور دیکھو وہی غالب (اور) بخشنے والا ہے۔ (۵۳۹-۵)

قَالُوا إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنََّّا لَنَبْعُوثُونَ (۸۲)
ترجمہ: کہتے ہیں کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ (۸۲:۲۳)

تفسیر: اس نے آسمان اور زمین بے مقصد و غایت پیدا نہیں کیے ہیں کہ نیکی و بدی اور حق و باطل کا اس میں کوئی امتیاز ہی نہ ہو جو چاہے سفارشوں کے بل پر اپنے لیے اونچے رتبے خدا کے ہاں محفوظ کرا لے، خواہ اس کے اعمال و عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ دنیا ایک بالکل باطل کا کارخانہ بن جاتی ہے۔ اور ایک حکیم و عادل خالق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ باطل کام کرے۔ (تدبر قرآن جلد ششم ص ۵۶۴۔)

درج بالا آیات کے حوالے کے بعد علامہ لکھتے ہیں :

”ایسے ہی بعض دوسری آیات میں جہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہمارا حساب زمانی ایک اضافی امر ہے۔ یہ بھی مذکور ہے کہ شعور کے بعض ایسے مراتب بھی ہیں جن کا ہمیں کوئی علم نہیں۔“ (تشکیل جدید ص ۷۱۔)

اس حوالے سے ایم سعید شیخ نے چند آیات کا حوالہ دیا ہے :

وَإِذْ تَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ط وَإِنَّ
يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۴۷)

ترجمہ: اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ اور ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو۔ (۴۷:۲۲)

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي

يَوْمَ كَانَ مِقْدَارُهُ ۚ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۵)

۲۔ وہی آسمان سے زمین تک (کے) ہر کام کا انتظام کرتا ہے پھر وہ ایک روز جس کا مقدار تمہارے شمار میں ہزار برس کا ہوگا اس کی طرف صعود اور (رجوع) کرے گا۔ (۳۲-۵)

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ (۴) ۴

۳۔ جس کی طرف روح الامین اور فرشتے چڑھتے ہیں (اور) اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ (۷۰-۴)

ان آیات کے بعد علامہ مسئلہ زمان کے موضوع پر بحث کرتے ہیں اور اس پر خصوصیت سے برگساں کا ذکر کرتے ہیں اور اس موضوع پر بھی مزید آیات کا حوالہ دیتے ہیں:

”حاصل کلام یہ ہے کہ اتانے بصیر کا زمانہ محض ایک آن ہے۔ جس کو اتانے فعال دنیائے خارج سے رسم و راہ کے باعث، آفات، کے ایک سلسلے میں تقسیم کر دیتا ہے اور جس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے کسی لڑی میں موتیوں کے دانوں کی، یہ ہے بلا شائبہ مکان جس کے معنی استدام کے یہی باسلسلہ اور بے سلسلہ پہلو ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے آیات ذیل میں بڑی سادگی اور بلاغت سے اشارہ کیا ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۷۵)

اس موقع پر سورہ فرقان کی آیت نمبر ۵۸ اور ۵۹ دی گئی ہیں :

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ط وَكَفَى بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (۵۸) ۴ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ ۚ ث الرَّحْمَانُ فَسَلِّ بِهِ خَبِيرًا (۵۹)

ترجمہ: اور اس (خدائے) زندہ پر بھروسہ رکھو جو (کبھی) نہیں مرے گا اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر

رکھنے کو کافی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے

چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر جاٹھرا، وہ (جس کا نام) رحمان (یعنی بڑا

مہربان) ہے تو اس کا حال کسی باخبر سے دریافت کر لو۔ (۲۵-۵۸، ۵۹)

تفسیر: یعنی اپنے خدائے حی لایموت پر بھروسہ رکھو، وہ زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ

رہے گا اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی محروم و نامراد نہیں ہوتے اس میں ایک لطیف تعریض

مشرکین کے ان خداؤں پر ہے جن کی نسبت فرمایا ہے کہ نہ وہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

یہ اسی خدائے حی لایموت کی مزید صفات بیان ہوئیں کہ اس نے آسمان و زمین اور

ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، چھ دن سے مراد خدا کے ایام ہیں جن

کے طول و عرض کو وہی جانتا ہے، ہم ان کو اپنی زبان میں چھ ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس

میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں آگئی بل کہ

اس کے خالق نے اس کو نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے۔ (تدبر قرآن - ص ۴۸۰)

فرمایا کہ خدا نے اپنی جو صفتیں بیان فرمائی ہیں اس کی حقیقی صفتیں وہ ہیں نہ کہ وہ جو تم

نے اپنے جی سے گھڑ کر اس کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ اگر اس کی صفتیں معلوم کرنی ہیں تو

انکل کے تیر نہ چلاؤ بل کہ اسی خیر سے معلوم کرو جو اپنی صفات سے سب سے زیادہ خود واقف

ہے۔ (تدبر قرآن - ص ۴۸۱)

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (۴۹) وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ

كَلِمَةٍ بِالْبَصْرِ

ترجمہ: ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اور ہمارا حکم تو آنکھ

جھپکنے کی طرح بات ہوتی ہے۔ (۵۲-۴۹، ۵۰)

تفسیر: امام مسلم اور ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ مشرکین مکہ نے آ کر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں مباحثہ شروع کر دیا۔ ان المشرکین

--- سے خلقنا بقدر۔ یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر: ہم نے تمہارے اعمال کو خاص انداز میں پیدا کیا، مگر تم اس کے منکر ہو جیسا

کہ قدر یہ فرقہ لکھتا ہے یا یہ کہ ہم نے ہر چیز کی شکل و صورت اور اس کی ضروریات کو خاص انداز سے پیدا کیا اور ہمارا حکم قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں بس اچانک ایسا ہو جائے گا جیسے آنکھ کا جھپکنا (تفسیر ابن عباس۔ جلد سوم۔ ص ۳۱۲)

۲۔ قدر سے مراد ہے تخلیق سے پہلے اندازہ کر لینا، یا قدر سے مراد ہے امر مقتدر جو لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے اور ہر چیز کی پیدائش سے پہلے اللہ کو اس کا علم ہے، وہی شے کی حالت اور (پیدائش کے) وقت سے واقف ہے، حسن نے کہا کہ قدر خداوندی سے مراد وہ خاص اندازہ تخلیق جو اللہ کی حکمت کا مقتضا ہے اور ویسا ہی چیز کو ہونا چاہیے۔ (تفسیر مظہری۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۳۲)

۳۔ یعنی دنیا کی کوئی چیز بھی اللہ ٹپ نہیں پیدا کر دی گئی، بل کہ ہر چیز کی ایک تقدیر ہے جس کے مطابق وہ وقت مقررہ پر بنتی، ایک خاص شکل اختیار کرتی ہے ایک خاص حد تک نشوونما پاتی ہے، ایک خاص مدت تک باقی رہتی ہے اور ایک خاص وقت میں ختم ہو جاتی ہے، اس عالم گیر ضابطہ کے مطابق خود اس دنیا کی بھی ایک تقدیر ہے، جس کے مطابق ایک وقت خاص تک یہ چل رہی ہے اور ایک خاص وقت میں اسے ختم ہونا ہے، جو وقت اس کے خاتمے کے لیے مقرر کیا گیا ہے نہ اس سے ایک گھڑی پہلے ختم ہوگی نہ ایک گھڑی بعد باقی رہے گی۔ (تفہیم القرآن جلد پنجم۔ ص ۲۳۱۔)

ان آیات کے ساتھ ہی علامہ فرماتے ہیں :

”جب ہم اس حرکت کا مشاہدہ جس کا اظہار عمل تخلیق میں ہوتا ہے خارج سے کرتے ہیں، یعنی عقلاً اس کو اپنے تصور میں لاتے ہیں تو یہ عمل ہزار ہا سال پر ممتد نظر آتا ہے۔ عہد نامہ عتیق کی طرح قرآن مجید کی اصطلاح میں بھی خدا کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۷۵)

اس حوالے سے ایم سعید شیخ نے درج ذیل آیت کا حوالہ دیا ہے :

وَیَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ط وَإِنَّ

يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۴۷)

ترجمہ: اور یہ (لوگ) تم سے عذاب میں جلدی کر رہے ہیں اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اور بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کی رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔ (۲۲-۴۷)

مسئلہ تقدیر اور زمان کے حوالے سے ان آیات کے بعد علامہ لکھتے ہیں :

”چنانچہ بہ طور ایک نامی کل زمانے کا یہی تصور ہے جس کو قرآن پاک نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک ٹھیک سمجھ سکی، نہ غیر اسلامی دنیا۔ دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کے امکانات کا انکشاف ابھی باقی ہے۔ یہ گویا وہ زمانہ ہے جو علت و معلول کی ترتیب سے آزاد ہے، علیٰ ہذا اس ہندی شکل سے جس کا از روئے فہم منطقی متشکل ہونا ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر یہ وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں وہ نہیں جو ہمارے تصور میں آتا ہے اور جس کا ہم حساب و شمار کرتے ہیں۔“ (تشکیل

جدید۔ ص ۷۶، ۷۷)

لہذا بہ حیثیت تقدیر، زمانہ ہی ہر شے کا جوہر ہے، قرآن پاک کا بھی یہی ارشاد ہے۔ ہم ہی نے ہر شے پیدا کی اور ہم ہی نے اس کا اندازہ مقرر کیا۔

(یہاں تشکیل جدید میں حاشیے میں اس آیت کا حوالہ ۱۹۵-۵۴۔ جو درست نہیں بل کہ حوالہ جات کی سابقہ ترتیب کے مطابق جس میں پہلے سورہ کا نمبر اور پھر آیت کا نمبر دیا گیا، یہ عجیب حوالہ ہے۔ البتہ انگریزی متن مرتبہ محمد سعید شیخ نے اس عبارت کے حاشیے میں تین آیات کے حوالے تحریر ہیں یہاں انھی کا ترجمہ، تفسیر پیش ہے۔

۱۔ سورہ فرقان آیت نمبر، ۲ :

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ
يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ
تَقْدِيرًا (۲)

ترجمہ: وہی کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے اور جس نے (کسی کو) بیٹا نہیں بنایا اور جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا۔ (۲۲۵-۲)

تفسیر: وہ ایسی ذات ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین یعنی بارش و نباتات کی حکومت حاصل ہے اور بہ قول یہود و نصاریٰ کے اس نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اس کا شریک ہے حکومت میں جیسا کہ مشرکین عرب بکتے رہتے ہیں۔ اور اس نے ہر موجود چیز کو پیدا کیا خواہ وہ شے موجود اس کی عابد ہو یا نہ ہو اور پھر سب کی عمریں، رزق اور اعمال الگ الگ انداز میں رکھایا یہ کہ ہر زر کے لیے مادہ بنائی۔ (تفسیر ابن عباس جلد دوم۔ ص ۳۷۶)

یعنی اس کو ٹھیک بنایا جو خواص اس میں پیدا ہونا مقصود تھا اس کے مطابق اس چیز میں تخلیقی صلاحیت پیدا کر دی جیسے انسان میں فہم، ادراک، غور و فکر، تدبیر، نوع در نوع صنعتوں کے اختراع اور گونا گوں افعال و اعمال پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایک معین و مقرر وقت تک باقی رکھنا اس کے لیے مقدر کر دیا۔ (تفسیر مظہری۔ جلد ششم۔ ص ۲۸۴)

..... انگریزی متن مرتبہ ایم سعید شیخ میں دوسرا حوالہ ۵۴-۴۹ ہے۔

یہ سورہ القمر کی آیت نمبر ۴۹ ہے جو اس سے قبل صفحات میں بھی آچکا ہے :

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (۴۹)

ترجمہ: ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی۔ (۴۹-۵۴)

انگریزی متن میں تیسری آیت سورہ الاعلیٰ کی دوسری اور تیسری آیت ہے :

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى (۲) ۶ ص وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (۳)

ترجمہ: جس نے (انسان) کو بنایا پھر (اس کے اعضا کو) درست کیا اور

جس نے اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) رستہ بتایا۔ (۳۲-۸۷)

تفسیر: یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا

ہے اور اس کام کے لیے اس کی مقدار کیا ہو۔ اس کی شکل کیا ہو، اس کی صفات کیا ہوں اس

کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقا اور قیام اور فعل کے لیے مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وجود میں آئے گی کب تک اپنے حصے کا کام کرے گی اور کب تک ختم ہو جائے۔ اس پوری اسکیم کا مجموعی نام ”تقدیر“ ہے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ ص۔ ۳۱۱)

”زمان حقیقی کی زندگی زمان متسلسل کی زنجیروں سے آزادی، اور اس لیے لمحہ بہ لمحہ خلاق، کی زندگی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۷۸)

آیہ سورہ رحمان۔ ۲۹:

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي
شَأْنٍ (۲۹) ؕ

ترجمہ: آسمان اور زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ (۲۹-۵۵)

تفسیر: یعنی ہر وقت اس کا رگاہ عالم میں اس کی کار فرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے کسی کو مار رہا ہے، کسی کو جلا رہا ہے، کسی کو اٹھا رہا ہے، کسی کو گرارہا ہے، کسی کو شفا دے رہا ہے اور کسی کو بیماری میں مبتلا کر رہا ہے، کسی ڈوبتے کو بچا رہا ہے اور کسی تیرتے کو ڈبو رہا ہے۔ بے شمار مخلوق کو طرح طرح سے رزق دے رہا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں نئی نئی وضع اور شکل و اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی، ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا خلاق ہر بار اسے ایک نئی صورت میں ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ ص، ۲۶۱)

کائنات اضافہ پذیر ہے

”قرآن کی رو سے کائنات میں اضافہ ممکن ہے وہ ایک اضافہ پذیر کائنات ہے کوئی بنا بنایا مصنوع نہیں جس کو اس کے صنایع نے مدت ہوئی تیار کیا تھا مگر جو اب مادے کے ایک بے جان ڈھیر کی طرح مکان مطلق میں پڑا ہے جس میں زمانے کا کوئی دخل نہیں اور اس لیے اس کا وجود عدم برابر ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص۔ ۸۵)

یہاں علامہ نے سورہ الفرقان کی آیت نمبر ۶۲ کا حوالہ دیا ہے تشکیلِ جدید میں حاشیے میں حوالہ ۱۵-۶۳ درج ہے جو بالکل غیر متعلق ہے تاہم انگریزی متن (مرتبہ ایم سعید شیخ) میں حوالہ درست ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّبَنِّ ارَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ
أَوْ ارَادَ شُكُورًا (۶۲)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے
جانے والا بنایا (یہ باتیں) اس شخص کے لیے جو غور کرنا چاہے یا شکر گزاری کا
ارادہ کرے (سوچنے اور سمجھنے کی ہیں)۔ (۶۲-۲۵)

تفسیر: یعنی چاند سورج وغیرہ کا الٹ پھیر اور رات دن کا ادل بدل اس لیے ہے کہ
اس میں دھیان کر کے لوگ خداوندِ قدیر کی معرفت کا سراغ لگائیں کہ یہ سب تصرفات و تقلبات
عظیمہ اسی کے دستِ قدرت کی کارسازیاں ہیں اور رات دن کے فوائد و انعامات کو دیکھ کر شکر
گزاری کی طرف متوجہ ہوں۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۸۷)

۲۔ مقصود ان آیات سے انسان کو بتلانا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے
ستارے شمس و قمر اور ان کے ذریعہ رات دن کا انقلاب اور ان کی تاریکی اور روشنی اور زمین و
آسمان کی تمام کائنات اس لیے پیدا کیے کہ غور و فکر کرنے والے کے لیے اس میں حق تعالیٰ کی
قدرت کاملہ اور توحید کے دلائل فراہم ہوں اور شکر گزار کے لیے شکر کے مواقع ملیں تو جس شخص
کا وقت دنیا میں ان دونوں چیزوں سے خالی گزر گیا اس کا وقت ضائع ہو گیا اور اس کا اس
المال بھی فنا ہو گیا۔ (معارف القرآن۔ جلد ششم۔ ص ۴۷۵)

آگے چل کر علامہ نے ذاتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے جو عبارت لکھی ہے اس
میں قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے۔

خدا بے نیاز ہے اس جیسا کوئی نہیں

”زندہ وہی ہے جو میں ہوں یا انا الموجود کہ سکے۔ پھر یہ انا الموجود ہی کا

وجدان ہے جس سے مدارج ہستی میں ہماری جگہ متعین ہوتی ہے۔ یوں کہنے میں انسان بھی کہتا ہے 'میں ہوں' لیکن اس کا 'میں ہوں' اس کے اپنے اختیار میں نہیں، بل کہ ذات اور غیر ذات میں امتیاز کا نتیجہ ہے۔ ذات بحت البتہ، جیسا کہ قرآن پاک میں کا ارشاد ہے، 'غنی عن العالمین' ہے لہذا اس کے لیے غیر ذات کی حیثیت ذات مقابل کی نہیں، ورنہ اسے بھی غیر ذات سے وہی نسبت مکانی ہوتی جو ہماری ذات متناہیہ کا اپنے غیر سے ہے۔ لہذا فطرت یا عالم طبعی ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے حیات الہیہ میں۔ اس کا 'ہونا' مستقل بالذات ہے، اس کی اپنی سرشت اور وجود میں داخل، وہ سرتا سر مطلق ہے اور اس لیے ناممکن ہے ہم اس کا کوئی کامل و مکمل تصور قائم کر سکیں۔ قرآن کا ارشاد ہے 'لیس کمثلہ شیء' (تشکیل جدید، ص ۸۶)

اس عبارت کے انگریزی متن میں چند آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا ترجمہ یوں

ہے :

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا
 ط وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَ
 مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۹۷)

۱۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہو اس نے امن پالیا اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض ہے) کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے (۳-۹۷)

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّنَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ
 الْعٰلَمِيْنَ (۶)

۲۔ اور جو شخص محنت کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے محنت کرتا ہے

(اور) خدا تو سارے جہان سے بے پروا ہے (۲۹-۶)

إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي ۚ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ
لِيَذُكَّرَ عَلَيَّ (۱۴)

۳۔ بے شک میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت
کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو (۲۰-۱۴)

فَاطْرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۚ يَذُرُّكُمْ فِيهِ ۖ لَيْسَ
كَثَلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۱۱)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (وہی ہے) اسی نے تمہاری ہی جنس کے
جوڑے بنائے اور چار پائیوں کے بھی جوڑے بنائے (اور) اس طریق پر تم کو
پھیلاتا رہتا ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا اور سنتا ہے (۲۲-۱۱)

طرت سنت اللہ ہے

”فطرت کو ذات الہیہ سے وہی نسبت ہے جو سیرت و کردار کو ذات انسانی سے۔“

قرآن مجید نے بھی کس خوبی سے اسے ’سنت اللہ‘ ٹھہرایا ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۸۶)

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ
اللَّهِ تَبْدِيلًا (۶۲)

ترجمہ : جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں اللہ کی عادت یہی
رہی اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔ (۳۳-۶۲)

اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۖ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ
السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۖ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتِ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن
تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ
تَحْوِيلًا (۴۳)

۲۔ یعنی انہوں نے ملک میں غرور کرنا اور بُری چال چلنا (اختیار کیا) اور

بُری چال کا وبال اس کے چلنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یہ اگلے لوگوں کی روش اور کسی چیز کے منتظر نہیں سو تم خدا کی عادت میں تو ہرگز تبدیل نہ پاؤ گے اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔ (۳۵-۳۳)

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۗ وَلَكِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۲۳)

۳۔ (یہی) خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت بدلتی نہ دیکھو گے۔ (۲۸-۲۳)

”پھر زمان متسلسل بھی تو دراصل استدام محض ہے، گو فکر اس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے گو یہ بھی ایک حیلہ ہے جس کے ذریعے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ کی تخلیقی فعالیت کا احصاء جس کا سلسلہ پیہم جاری ہے مقداری طور پر کر سکیں، قرآن پاک کے اس ارشاد ”لَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ“ میں میرے نزدیک یہی حقیقت پیش نظر ہے“ (تشکیل جدید، ص ۸۹)

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ط
أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۸۰)

ترجمہ : اور وہی ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور رات اور دن کا بدلتے رہنا اسی کا تصرف ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔ (۲۳-۸۰)

”برعکس اس کے یہاں اس کی حقیقی نوعیت کا اظہار مسلسل خلاقی میں ہو رہا ہے جس میں تھکن کا شائبہ ہے نہ اونگھ اور نیند کا اس کو بے تغیر ٹھہرایا گیا ہے تو اس کا تصور محض ایک تعطل ایک بے مقصد اور بے حرکت بے رنگی یا مطلق لاشے ہی کے طور پر کر سکیں گے۔“ (تشکیل جدید، ص ۹۱)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ق
صَلِّے وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ (۳۸)

ترجمہ : اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو (مخلوقات) ان میں ہے

سب کو چھ دن میں بنا دیا اور ہم کو ذرا بھی تھکان نہیں ہوا۔ (۳۸-۵۰)

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۲۰۵)

ترجمہ : اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا نہیں پکڑ سکتی اُس کو اونگھ اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ سب کا احاطہ نہیں کر سکتے کسی چیز کا اس کی معلومات میں جتنا کہ وہ چاہے۔ گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو اور گراں نہیں اس کا بھامنا ان کا اور وہی ہے برتر عظمت والا۔ (۲-۲۵۵)

فطرت کا تصور

”فطرت کو ذات الہیہ سے وہی نسبت ہے جو سیرت و کردار کو انسانی ذات سے قرآن مجید نے بھی کس خوبی سے اسے سنت اللہ ٹھہرایا ہے“۔۔۔۔

(تشکیل جدید، ص ۸۶۔)

”فطرت کا تصور بھی بہ طور ایک زندہ اور ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وحدت نامیہ کی حیثیت سے کرنا چاہیے جس کی نشوونما پر ہم خارج سے کوئی حد قائم نہیں کر سکتے، اس کی کوئی حد ہے تو داخلی، یعنی وہ ذات مشہود جو اس میں جاری و ساری ہے اور جس نے اس کو سہارا دے رکھا ہے قرآن پاک کا ارشاد بھی یہی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۸۷)

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (۴۲)

ترجمہ: اور یہ کہ تمہارے پروردگار کے پاس ہی پہنچنا ہے۔ (۴۲-۵۳)

تفسیر: اور یہ بات بھی واضح رہے کہ سب کی بازگشت تیرے رب کی طرف ہوگی اس مغالطے میں کوئی نہ رہے کہ تیرے رب کے سوا کسی کا مرجع اور مولیٰ کوئی اور بھی ہے جو اس کو خدا کی باز پرس سے بچالے گا یا خدا کے فیصلوں کے خلاف کوئی مرافعہ اس کی عدالت میں کر سکے گا۔ خدا ہی کے حضور سب کی بھی پیشی ہوگی اور خدا کے فیصلے بالکل آخری اور حتمی ہوں گے۔ (تدبر قرآن۔ ص۔ ۷۸۔)

”اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو علوم طبعیہ میں بھی روحانی اعتبار سے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ فطرت کا علم سنن الہیہ کا علم ہے جس کے مشاہدے میں ہم ذاتِ مطلق ہی سے قرب و اتصال کی سعی کرتے ہیں اور اس لیے یہ بھی گویا عبادت ہی کی دوسری شکل ہے“

(تشکیلِ جدید۔ ص۔ ۸۷۔)

”زمان متسلسل بھی تو دراصل استدام محض ہے گو فکر اس کو پارہ پارہ کرتا رہتا ہے گو یہ بھی ایک حیلہ ہے جس کے ذریعے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ کی تخلیقی فعالیت کا احسا جس کا سلسلہ پیہم جاری ہے مقداری طور پر کر سکیں قرآن پاک کے اس ارشاد۔۔۔ میں بھی میرے نزدیک یہی حقیقت پیش نظر ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص۔ ۸۹)

یہاں سورہ المؤمنون کی آیت نمبر ۸۰ کا ایک حصہ پیش کیا گیا ہے :

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۸۰)

ترجمہ: اور وہی ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے اور رات اور دن کو بدلتے رہنا اسی کا تصرف ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔ (۸۰-۲۳)



ذات الہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا

The Conception of God and the Meaning of Prayer

اس مقالہ میں علامہ فلسفہ کی روشنی میں خدا کے اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ انسانی ذرائع علم کے اجتماعی تجربہ سے ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ ان ذرائع کی اساس کوئی باہر تخلیقی مشیت ہے جسے خودی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خودی کی مطلق انفرادیت کے پیش نظر قرآن نے اس کے لیے اللہ کا اسم معرفہ استعمال کیا۔ خودی مطلق لامتناہی ہے، اس کی لامحدودیت وسیع ہونے کے بجائے عمیق ہے۔

بعد ازاں علامہ اس سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ خدا کی تخلیقی فعلیت سے عمل تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوتی ہے، اس مرحلہ پر اقبال قرآنی آیات کی روشنی میں اشاعرہ کے افکار پیش کرتے ہیں، اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جوہر یا ان لا تعداد چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہوئی جن کا مزید تجزیہ ناممکن ہے اور چوں کہ تخلیقی فعلیت کا سلسلہ جاری ہے اس لیے جوہر کی تعداد لامتناہی ہے، ہر لحظہ نئے جوہر عدم سے وجود میں لائے جاتے ہیں اور کائنات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اقبال کے نزدیک ان افکار کی روشنی میں خدا کا تخلیقی عمل وحدتوں کی صورت ہی ہوتا ہے جن کو وہ خودیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کائنات کا جوہر خودی ہی کی پست و بالا صورت ہے البتہ وہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ذاتِ انسانی میں اپنے معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ اسی سبب سے قرآن حکیم نے مطلق خودی کو شہ رگ کے قریب ٹھہرایا ہے، حیات الہیہ کا سیل رواں

تمام خودیوں کا سرچشمہ ہے اور ہم اس میں موتیوں کی طرح زندہ اور متحرک ہیں، اس اعتبار سے انسان ہی جملہ مخلوق میں اس قابل ہے کہ خدا کی حیاتِ تخلیقی میں ایک معاون یا ہم کار کی طرح عہدِ اُحصہ لے اور چوں کہ وہ ایک بہتر اور خوب تر عالم کا تصور کر سکتا ہے اس لیے موجود کو مطلوب میں بدلنے کا اہل ہے۔

اقبال کی نگاہ میں فلسفہ تو صرف تصورات پر قناعت کرتا ہے لیکن مذہب اپنے مقصود کا زیادہ گہرا علم حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ اور یہ قرب دعا کے ذریعے ہی میسر ہوتا ہے۔ دعا کا تعلق روحانی تجلیات سے ہے اور اس سے مختلف طبیعتیں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔ (ملخص از: زندہ رود، ڈاکٹر جاوید اقبال، جلد سوم، ص ۳۷۶)

اللہ تعالیٰ کا تصور

”جب ہم محسوسات و مدرکات کے نسبتاً زیادہ اہم عوامل پر اس خیال سے نظر ڈالتے ہیں کہ ان کا سلسلہ ایک دوسرے سے جوڑ دیں تو اس اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہمارے محسوسات و مدرکات کی اساس کوئی باہر اور تخلیقی مشنیت ہے جس کو بوجہ ایک۔ انا۔ ہی سے تعبیر کیا جائے گا چنانچہ یہی انا ہے جس کی انفرادیت کے پیش نظر قرآن پاک نے اس کے لیے اللہ کا اسم معرفہ استعمال کیا ہے اور پھر اس کی وضاحت ان آیات میں کی۔“

(تشکیلِ جدید، ص ۹۵)

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱) ۚ اللَّهُ الصَّمَدُ (۲) ۚ لَمْ يَلِدْ ۚ وَ لَمْ يُولَدْ (۳) ۚ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (۴) ۚ

ترجمہ: کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے ایک ہے (وہ) معبود برحق ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔

(سورہ اخلاص۔ ۱۔ ۴)

تفسیر: ترمذی، حاکم اور خزیمہ نے ابوالعالیہ کے طریق سے محمد ابن کعب سے

روایت کیا ہے کہ مشرکین نے حضور سے کہا کہ اپنے پروردگار کا نسب بیان کریں اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور طبرانی اور ابن جریر نے جابر کی روایت سے اس سورت کے ٹکے ہونے پر استدلال کیا ہے۔

اور ابن جریر نے ابو لعلیہ سے روایت کیا ہے کہ قتادہ نے بیان کیا کہ مختلف لوگوں نے کہا کہ اپنے پروردگار کا نسب بیان کرو، چنانچہ آپ کے پاس جبرائیل یہ سورت لے کر آئے۔ اور ابی ابن کعب کی روایت میں جو مشرکین کا لفظ آیا ہے اس سے یہی مراد ہیں۔ یہ سورت مدنی ہے جیسا کہ ابن عباس کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد دوم، ص ۵۰۱)

ذات الہیہ کا تصور

”مشکل یہ ہے کہ ہمارے لیے فرد کا ٹھیک ٹھیک تصور قائم کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ جیسا کہ ارتقائے تخلیقی میں برگساں نے لکھا ہے انفرادیت کے کئی مدارج ہیں، حتیٰ کہ ذات انسانی کی الگ تھلگ وحدت میں بھی اس کا تمام وکمال اظہار نہیں ہوتا۔ برگساں کہتا ہے اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ نظم و ضبط کی دنیا میں اگرچہ ہر جگہ انفرادیت کا رجحان غالب ہے مگر پھر یہیں ایک دوسرا یعنی توالد و تناسل کا رجحان اس کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ انفرادیت کا کمال ہی یہ ہے کہ کسی زندہ جسم کا کوئی حصہ الگ تھلگ اپنی ہستی برقرار نہ رکھ سکے۔ لیکن اس صورت میں توالد و تناسل کا عمل ناممکن ہوتا۔ اس لیے توالد و تناسل کا مطلب ہے جسم سابق کے ایک ٹکڑے کا اس طرح منفصل ہونا کہ اس سے ایک نیا جسم وجود میں آسکے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں انفرادیت نے خود اپنے گھر میں اپنا ایک دشمن پال رکھا ہے۔ سطور بالا کے یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ فرد کامل کی ذات میں بھی جو بہ حیثیت ایک ’انا‘ کے اپنے آپ میں محدود اور اس لیے دوسروں سے الگ تھلگ، بے مثل اور یکتا ہے، خود اس کا دشمن موجود ہے۔ لہذا ہم اس کا تصور کریں گے تو یہ سمجھتے

ہوئے کہ اس کی ذات تو والد و تناسل کے رجحان سے بالاتر ہے۔ انیت کاملہ کی یہی خصوصیت ذات الہیہ کے تصور کا بنیادی جزو ہے جو قرآن پاک نے اس باب میں قائم کیا ہے اور پھر جس پر بار بار زور دیا تو اس لیے نہیں کہ قرآن پاک کو اس وقت کے مروجہ مسیحی عقیدے کی تردید منظور تھی، بل کہ اس لیے کہ فرد کامل کے ٹھیک ٹھیک تصور میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔“
(تشکیل جدید، ص ۹۵، ۹۶)

ذات الہیہ کے تصور کے ضمن میں درج بالا عبارت کے انگریزی متن میں متعدد آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جن کا ترجمہ پیش ہے :

وَإِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ
الرَّحِيمُ (۱۶۳)

۱۔ اور (لوگو) تمہارا معبود خدائے واحد ہے اس بڑے مہربان (اور) رحم کرنے والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ (۱۶۳-۲)

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
إِلَّا الْحَقَّ ۗ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَ
كَلِمَتُهُ ۗ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۚ فَآمَنُوا بِاللَّهِ وَ
رُسُلِهِ قَفًا ۗ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةً ۗ إِنْتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۗ إِنَّمَا اللَّهُ
إِلَهٌ وَاحِدٌ ۗ سُبْحٰنَهُ ۗ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۗ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا (۱۷۱)

۲۔ اے اہل کتاب اپنے دین (کی بات) میں حد سے نہ بڑھو اور خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو مسیح (بھی) مریم کے بیٹے عیسیٰ (نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بل کہ) خدا کے رسول اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح تھی تو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (یہ) نہ کہو (کہ خدا) تین (ہیں اس اعتقاد سے)

بعض آو کہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، خدا ہی معبود واحد ہے اور اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور خدا ہی کار ساز کافی ہے۔ (۱۷۱:۴)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثَةٌ م وَ مَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهٌ وَاحِدٌ ط وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَكْسَنَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابَ الْيَمِّ (۷۳)

۳۔ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے حالاں کہ اس معبود یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے (اقال و عقائد) سے بعض نہیں آئیں گے تو ان میں جو کافر ہوئے وہ تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔ (۷۳:۵)

قُلْ أَيْ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ط قُلِ اللَّهُ قَفٌ شَهِيدٌ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ قَفٌ وَ أُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَ مَنْ بَلَغَ ط إِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَى ط قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ وَ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ (۱۹)

۴۔ ان سے پوچھو کہ نب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے کہ دو کہ خدا ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔ اور یہ قرآن مجھ پر اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے ذریعے تم کو اور جس شخص تک وہ پہنچ سکے آگاہ کر دوں۔ کیا تم لوگ اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور بھی معبود ہیں۔ (اے محمد) کہ دو کہ میں تو (ایسی) شہادت نہیں دیتا۔ کہ دو کہ صرف وہی

معبود ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ (۱۹:۶)

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ط قُلِ اللَّهُ ط قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَبْلُغُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَ لَا

ضَرَّاطٌ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَمْ هَلْ
تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ
خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهُ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۗ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۶)

۵۔ ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے (تم ہی ان کی
طرف سے) کہ دو کہ خدا۔ پھر (ان سے) کہو کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر ایسے
لوگوں کو کیوں کارساز بنایا ہے جو (اپنے) نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے
(یہ بھی) پوچھو ایسا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں یا اندھیر اور اجالا برابر ہو سکتا
ہے بھلا ان لوگوں نے جن کو خدا کا شریک مقرر کیا، کیا انھوں خدا کی سی
مخلوقات پیدا کی ہیں، جس کے سبب ان کو مخلوقات مشتبہ ہو گئی ہیں، کہ دو کہ
خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا (اور) زبردست ہے۔

(۱۶:۱۳)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ
الْوَّاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۸)

۶۔ جس دن یہ زمین بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیے جائیں
گے) اور سب لوگ خدائے یگانہ و زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں
گے۔ (۴۸:۱۳)

قُلْ إِنَّمَا يُوحِي إِلَيَّ أَنبَاءُ إِلَهكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ
مُسْلِمُونَ (۱۰۸)

۷۔ کہ دو کہ مجھ پر (خدا کی طرف سے) یہ وحی آتی ہے کہ تم سب کا معبود
خدائے واحد ہے تو تم کو چاہیے کہ فرماں بردار بن جاؤ۔ (۱۰۸:۲۱)

لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَأَصْطَفَىٰ مِنَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ
سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۴)

۸۔ اگر خدا کسی کو اپنا بیٹا بنا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا انتخاب کر لیتا، وہ پاک ہے وہی تو خدا یکتا (اور) غالب ہے۔ (۴:۳۹)

يَوْمَ هُمْ بَرْزُورُونَ ۝ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ط
لِيَمُنَّ الْمَلِكُ الْيَوْمَ ط لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۶)

۹۔ جس دن وہ لوگ نکل کھڑے ہوں گے، چھپی نہ رہے گی اللہ پر ان کی

کوئی چیز کس کا راج ہے اس دن، اللہ کا ہے اکیلا ہے دباؤ والا۔ (۱۶:۴۰)
بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط اَنۡىۡ يَكُوۡنُ لَهٗۙ وَاَلَدًا وَّ لَمۡ تَكُنۡ
لَهٗۙ صٰحِبَةً ط وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْۡءٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْۡءٍ
عَلِيۡمٌ (۱۰۱)

۱۰۔ (وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (ہے) اس کی اولاد کہاں سے ہو جب اس کی بیوی ہی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے (۱۰۱:۶)

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ط هُوَ الْغَنِيُّ ط لَهٗ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الْاَرْضِ ط اِنۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ
بِهٰذَا ط اتَّقُوۡلُوۡنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۶۸)

۱۱۔ بعض لوگ کہتے ہیں خدا نے بیٹا بنالیا ہے اس کی ذات (اولاد سے)

پاک ہے (اور) وہ بے نیاز ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے (اے افترا پردازو) تمہارے پاس (قول باطل) کی کوئی دلیل نہیں ہے تم خدا کی نسبت ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جو جانتے نہیں۔ (۶۸:۱۰)

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَمۡ يَتَّخِذۡ وَاَلَدًا وَّ لَمۡ يَكُنۡ لَهٗ
شَرِيۡكٌ فِى الْمَلٰٓئِكَةِ وَ لَمۡ يَكُنۡ لَهٗ وَّلِیٌّ مِّنَ الدُّنۡیَا وَ كَبِّرَہُ
تَكْبِيۡرًا (۱۱۱)

۱۲۔ اور کہو کہ سب تعریف خدا ہی کو ہے جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور

نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔

(۱۱۱:۱۷)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا (۸۸) ط لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِذَا
(۸۹) تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ
وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا (۹۰) ط أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا
(۹۱) ط وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا (۹۲) ط

۱۳۔ اور کہتے ہیں خدا بیٹا رکھتا ہے۔ (ایسا کہنے والو یہ تو) تم بری بات (زبان پر) لائے ہو قریب ہے کہ اس (افترا) پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں کہ انہوں نے خدا کے لیے بیٹا تجویز کیا، اور خدا کو شایان شان نہیں کہ بیٹا بنائے۔ (۹۲، ۸۸:۱۹)

ذات الہیہ کے تصور کے حوالے سے علامہ بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے سورہ

نور سے ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا
مِصْبَاحٌ ط الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ط الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ
دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبْرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا
غَرْبِيَّةٍ ط يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُورٌ عَلَى
نُورٍ ط يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ ط وَيَضْرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۳۵) ط

ترجمہ: خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے، جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل (ایسی شفاف ہے کہ) گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا تیل جلتا ہے اس میں برکت کے ایک درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف، قریب ہے اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ نہ لگی ہو اس میں آگ

روشنی پر روشنی، اللہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی جس کو چاہے اور بیان کرتا ہے اللہ
مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ سب چیز کو جانتا ہے۔ (۳۵:۲۳)

اس آیت کو پیش کرنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں :

”اس آیت کے حصے سے تو بے شک یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہاں بھی ذات
الہیہ کو انفرادیت سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جب ہم اس
استعارے کا تاخر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ امر واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ اس
کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہے، اس لیے کہ جوں جوں یہ استعارہ آگے
بڑھتا ہے اس خیال کی نفی ہو جاتی ہے کہ ذات الہیہ کا قیاس کسی لاصورت کوئی
عنصر پر کیا جائے۔“ (تشکیل جدید، ص ۹۷)

تفسیر: یعنی جیسا کہ چراغ کی روشنی سے راستہ معلوم کیا جاتا ہے اس طرح معرفت
خداوندی بھی ایک نور ہے جس کے ذریعے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ اور جیسا کہ قندیل
ایک نور ہے کہ جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اس طرح معرفت بھی ہدایت حاصل کرنے
کے لیے نور ہے اور جس طرح چمک دار اور روشن ستاروں سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں
راستہ معلوم کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح معرفت خداوندی سے کفر و شرک کی تاریکیوں میں
نجات حاصل کی جاتی ہے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد دوم، ص ۳۶۲)

اس آیت (آیہ نور) کے حوالے سے وہ بحث نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا جو
مکتوبات اقبال (مرتبہ) سید نذیر نیازی، اقبال اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۷ء) میں درج ہے۔
ایک روز تیسرے خطبے کے سلسلے میں آیہ نور کی بحث آگئی۔ مولانا اسلم نے فرمایا ڈاکٹر
صاحب نور کو مادی نور کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں اور پھر ہر چند کہ میں نے مولانا کی
غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اصرار رہا کہ میں ان کا خیال حضرت علامہ تک پہنچا
دوں۔ اس پر فوراً ارشاد ہوا بل کہ راقم کو ہلکی سی تنبیہ بھی فرمائی۔

(مکتوب علامہ اقبال) مولانا اسلم کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اس آیت کو تاریخی نقطہ نگاہ

سے دیکھنا چاہیے۔ اس مضمون کی آیات قریباً تمام کتب سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ

نہیں کہ خدامادی معنوں میں نور ہے۔ light dealt with in physical science

نور محض ایک استعارہ ہی ہے جیسے قدیم کتب سماوی میں pantheistic اغراض کے لیے

استعمال کیا گیا تھا یعنی وجود باری کو ہمہ گیر pervasive ظاہر کرنے کے لیے۔ قرآن نے

میری ناقص رائے میں اس قدیم استعارے کو وجود باری کی absoluteness پر اشارہ

کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کیوں کہ عالم مادی بھی زمانہ حال کی تحقیق کی رو سے صرف نور

ہی ایک ایسی چیز ہے جو relatively absolute ہے مقدمہ وغیرہ کا انتظام ابھی سے کر

لیجیے۔ مگر قرآن کہ معلوم ہوتا ہے تیسرے خطبے میں جو کچھ آیت مذکورہ میں لکھا ہے آپ اس کو اچھی

طرح سمجھ نہیں آسکی ورنہ مولانا اسلم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے کہ میرے خیال میں اس آیت

قرآنی میں خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو نور (مادی معنوں میں) قرار دیا ہے۔ (مکتوب اقبال)

(عبارت: نذیر نیازی) بہر حال میں نے مولانا کو علامہ کا مکتوب پڑھ کر سنایا لیکن

ان کو تسلی نہ ہوئی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو نور السموات والارض کہنا اس لیے نہیں کہ نور سے

مراد وہ نور نہیں جو مرئی کے ساتھ قائم ہے اور جسے قرآن پاک میں نصاب مخلوق کہا گیا ہے بل کہ یہ

وہ نور ہے جو رایء کے ساتھ قائم ہے یعنی جس سے اس عالم کی ہستی محسوس ہوتی ہے۔ لہذا یہ

آیت زیادہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ مزید تشخصات دراصل اس (نور) کو سمجھانے کے لیے ہیں۔

ان پر غور کرنا لازم ہے مثلاً بیت سے مراد ہے دین، طاق سے مرد مومن، زجاج سے ایمان

، زجاجہ سے قلب، زیت سے آسمانی تعلیم۔

(مکتوب علامہ اقبال) آیت نور کے متعلق میں نے جو لکھا ہے اسے تاویل کہنا صحیح

نہیں۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے عام معنی چھوڑ کر کوئی اور معنی لیے

جائیں۔ میں نے لفظ نور کے وہی معنی مراد لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے۔ اگر

آپ کہیں کہ اس آیت میں نور علیٰ ہذا القیاس زجاج وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہوگی،

میں نے اپنے تمام لیکچروں میں اس قسم کی تاویل سے پرہیز کیا ہے اور الفاظ کو ان ہی معنوں میں

لیا ہے جن میں وہ عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی طریق تھا، یہی طریق بحث ابن حزم کا ہے مولانا روم کا یہ شعر میرے لیے نہ صرف دلیل راہ ہے بل کہ سوز و گداز کا بھی سامان ہے :

کردہ تاویل حرف بکر را

خویش را تاویل کن نے ذکر را

باقی رہی دوسری آیت جس کا ذکر آپ نے اپنے آخری خط میں کیا ہے سو عرض ہے کہ ایک اعتبار سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تمام حوادث پہلے سے متعین ہیں۔ میرے لیکچروں کا مشکل حصہ غالباً یہی بحث ہے۔ اس کو غور سے پڑھنا چاہیے۔ میں نے اس حصہ میں time .. eternity کے تناقض کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ time کے اعتبار سے حوادث متعین نہیں eternity کے اعتبار سے ان کو متعین تصور کرنا بالکل بجا اور درست ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً جدید سائنس مزید روشنی ڈال سکے گی۔ Einstein سے اس بحث کا آغاز سمجھنا چاہیے، علما کے اعتراضات و تصورات سے زیادہ سروکار نہ رکھنا چاہیے، آپ کو وضع اصطلاحات کی فکر کرنا چاہیے۔ آخر یہ مباحث فلسفیانہ ہیں اور فلسفہ ایک متحرک شے ہے۔ اس کی کوئی دلیل جیسا کہ میں نے دیباچے میں لکھ دیا ہے قطعی اور آخری نہیں قرار دی جاسکتی۔ علم انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی تصورات بھی improve ہوتے جاتے ہیں۔ فلسفہ محض حقائق کو تصور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ (مکتوب علامہ اقبال)

(مکتوبات اقبال۔ مرتبہ: سید نذیر نیازی، اقبال اکیڈمی، کراچی، طبع ۱۹۵۷ء، صفحات ۳۹ تا ۴۵)

آیہ نور کے بعد علامہ نے وجود ذات باری تعالیٰ کے حوالے سے ایک دقیق بحث کی ہے جس کے درمیان ایک جگہ اشاعرہ کے قدرت الہیہ کے منہاج تخلیق کے تصور کے حوالے سے ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس آیت سے پہلے علامہ کہتے ہیں :

”اس سے پہلے کہ ہم اپنے سلسلہ بحث میں آگے بڑھیں ایک سوال کا جواب

دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ذات الہیہ کی تخلیقی فعالیت سے عمل تخلیق کی ابتدا

کس طرح ہوتی ہے۔ الہیات اسلامیہ کے سب سے متشرع اور تاحال مقبول عام مذہب یعنی اشاعرہ کے نزدیک قدرت کاملہ الہیہ کا منہاج تخلیق جو اہر کی آفرینش ہے معلوم ہوتا ہے ان کا عقیدہ اس آیت قرآنی پر مبنی تھا۔

(تشکیل جدید، ص ۱۰۳)

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِلُ إِلَّا بِقَدْرِ مَعْلُومٍ (۲۱)

ترجمہ: اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بہ مقدار مناسب اُتارتے رہتے ہیں۔ (۲۱-۱۵)

تفسیر: یہاں اس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بل کہ تمام موجودات کے معاملہ میں عام ہے، ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر نوع، ہر جنس اور ہر قوت و طاقت کی ایک مقرر حد ہے جس پر وہ ٹھہری ہوئی ہے اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے، اس تقدیر اور کمال کی حکیمانہ تقدیر ہی کا کرشمہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک پورے نظام کائنات میں توازن، بہ اعتدال اور تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات اتفاقی حادثہ ہوتی یا بہت سے خداؤں کی کاری گری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بت شمار مختلف اشیاء و قوتوں کے درمیان ایسا مکمل توازن و تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہتا۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۰۳)

کائنات میں اضافہ ہو رہا ہے

”شاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جو اہر یعنی ان لا انتہا چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہوئی جن کا مزید تجزیہ ناممکن ہے خالق کائنات کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ چوں کہ برابر جاری ہے اس لیے جو اہر کی تعداد بھی لامتناہی ہے کیوں کہ ہر لحظہ نئے نئے جو اہر پیدا کیے جا رہے ہیں اور اس لیے کائنات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے۔“

(تشکیل جدید، ص ۱۰۳)

(یہاں تشکیل میں آیت کا ٹکڑا تو درج کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ درج نہیں تاہم

اصل متن میں حوالہ موجود ہے اس کا ترجمہ یہ ہے)

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا
أُولَىٰ أَجْنِحَةٍ مِّثْنَىٰ وَثُلُثٌ وَرُبْعٌ ۖ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا
يَشَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱)

ترجمہ : سب تعریف اللہ ہی کو (سزاوار ہے) جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (اور) فرشتوں کا بنانے والا ہے جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہیں، وہ اپنی مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱:۳۵)

کائنات کا ہر عمل انکشافِ ذات

”گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جو اہر کی میکانیاتی حرکت سے ہو یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے، سب کی حقیقت بہ جز ایک عظیم اور برتر انا کے انکشاف کے سوا اور کچھ نہیں“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۰۹)

إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا عَبْدٌ نَبِيٌّ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ
لِيَذْكُرْنِي (۱۴)

حوالہ آیت: بے شک میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھو۔ (۱۳:۲۰)

حقیقتِ مطلقہ انسانی رگِ جان کے قریب

”قدرتِ الہیہ کا ہر جوہر خواہ اس کا درجہ ہستی پست ہو یا بلند، اپنی ماہیت میں ایک ’انا‘ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس انیت یا خودی کے اظہار کا بھی اپنا اپنا ایک درجہ ہے بڑا یا چھوٹا۔ بایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لفظ بہ لفظ تیز ہو رہا ہے اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی تو اسی لیے حقیقت مطلقہ کو انسانی رگِ جاں کے قریب
ترتھہرایا۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۰۹، ۱۱۰)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْمُ مَا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۗ صَلِّ
وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۱۶)

ترجمہ: اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا اور جو خیالات اس کے دل میں
گزرتے ہیں ہم جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب
ہیں۔ (۱۶-۵۰)

تفسیر: گردن کی رگ مراد ہے جسے شہ رگ کہتے ہیں اور جس کے کٹنے سے انسان
مر جاتا ہے، شاید کنایہ ہو جان اور روح سے، مطلب یہ ہوا کہ ہم (باعتبارِ علم کے) اس کی روح
اور نفس سے بھی نزدیک ہیں یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے
بھی زیادہ ہے نیز علت و منشا کے معلول اور ناشئ کے ساتھ قرب حاصل ہوتا ہے جو معلول اور
ناشئ کو خود اپنے نفس کے سے بھی نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۶۸۹)

زمان الہیہ أم الكتاب

”ذات الہیہ کی اولیت زمانے کی اولیت کا نتیجہ نہیں، بل کہ زمانے کی اولیت
ذات الہیہ کی اولیت کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے زمان الہیہ کو
’ام الكتاب‘ تھہرایا ہے جس میں سارا عالم تاریخ علت و معلول کی قید تو اتر
سے آزاد ہو کر ایک واحد اور فوق الدیمومت آن میں جمع ہو گیا ہے۔“

(تشکیلِ جدید، ص ۱۱۵)

انگریزی متن میں اس حوالے سے تین آیات کا حوالہ دیا گیا ہے :

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ
أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَبِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ
فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ
وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ

امَّنَابِهِ ۚ كُلُّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو
الْأَلْبَابِ (۷)

۱۔ ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں (اور) وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں، تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں، حالاں کہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جو لوگ علم میں دست گاہِ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی قبول کرتے ہیں۔

(۷:۳)

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُثَبِّتُ صَلِيٌّ ۚ وَعِنْدَهُ أُمُّ
الْكِتَابِ (۳۹)

۲۔ خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔ (۳۹:۱۳)

وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ (۴) ط

۳۔ اور یہ بڑی کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں ہمارے پاس (لکھی ہوئی اور) بڑی فضیلت (اور) بڑی حکمت والی ہے (۴:۲۳)

اختلافِ لیل و نہار

تشکیلِ جدید ص ۱۱۷۔ حوالہ آیت۔

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ط
أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۸۰)

ترجمہ: کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا اور اس کے مقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

(۸۰:۲۳)

عالمِ فطرت

”قرآن مجید نے مجرد کلیات سے کبھی اعتنا نہیں کیا۔ اس کی نظر حقائق پر ہے اور یہ وہ سبق ہے جو نظریہ اضافیت سے جدید فلسفہ نے حال ہی میں سیکھا ہے۔ بات یہ ہے فعالیت خواہ اس کی نوعیت تخلیقی ہو یا اس سے مختلف، ایک قسم کی تحدید ہے جس کے بغیر بہ طور ایک فی الواقعہ، موجود اور فعال انا کے، ہم ذات الیہہ کا تصور ہی نہیں کر سکتے، مجرد نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی قدرتِ کاملہ عبارت ہوگی ایک اندھا دھند اور بے راہ قوت سے، جس پر کسی پہلو سے کوئی حد قائم نہیں ہوتی حالاں کہ قرآن مجید نے بہ صراحت کہا ہے کہ عالمِ فطرت باہم دگر مربوط قوی کا ایک نظام ہے اور اس لیے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ میں اس کی حکمت کا بڑا دخل ہے۔ اس کی لا انتہا اور لامحدود طاقت کا اظہار کسی بے راہ اور من مانے طریق پر نہیں ہوتا اس میں ایک اصول یک باقاعدگی، ایک نظم اور ایک ترتیب کارفرما ہے۔ مزید براں قرآن مجید کا یہ بھی تو ارشاد ہے کہ جو بھی خیر ہے وہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔“

(تشکیلِ جدید، ص ۱۲۱۔)

اس عبارت کے حوالے سے تشکیل میں اس موقع پر حاشیے میں سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۵ کا حوالہ دیا گیا ہے (جو دراصل ۲۶ ہے) جس کا ترجمہ و تفسیر یوں ہے :

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكِ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ط
بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶)

ترجمہ: کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور

جسے چاہے ذلیل کر دے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“ (۳-۲۶)

تفسیر: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اللہ تعالیٰ سے اس طرح عرض کیجیے۔ اے اللہ ہمیں نیکی کے راستے پر چلا، اے تمام ملک کے مالک آپ ملک کا جتنا حصہ جس کو چاہیں دے دیتے ہیں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کو اور جسے چاہیں مثلاً فارس و روم، دے دیتے ہیں اور جسے چاہیں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عزت دے دیتے ہیں اور عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں اور اہل فارس اور روم کو رسوا کر دیتے ہیں، عزت و ذلت، بادشاہت اور مال غنیمت۔ نفرت و دولت آپ کے قبضہ قدرت میں ہے اور آپ بخشنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد اول۔ ص ۱۸۰)

تشکیل جدید میں صرف اسی آیت کا حوالہ ہے جب کہ اسی عبارت کے انگریزی متن میں مزید آیات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ جن کا ترجمہ یوں ہے۔ پہلے عالم فطرت کے مربوط ہونے کے بارے میں سورہ الملک کی آیات ۳، ۴ پیش کی گئی ہیں۔ پھر عزت و مرتبے اور ذلت کے حوالے سے آیات دی ہیں۔

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ
الرَّحْمَنِ مِن تَفْوُوتٍ ط فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن
فُطُورٍ (۳) ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ
خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (۴)

ترجمہ: اس نے سات آسمان اوپر تلی بنائے۔ (اے دیکھنے والے) کیا تو وہ (خدائے) رحمن کی آفرینش میں کوئی نقص دیکھتا؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔ (۳:۶۷)

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ تُوْتِي الْمَلِكِ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ

الْمُلْكُ مِمَّنْ تَشَاءُ ز وَتُعْزُّمَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ط
بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶)

ترجمہ: کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی
بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے، اور جس کو چاہے عزت دے اور
جسے چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور
بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۶:۳)

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ ط قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ
اللَّهِ ۗ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيْتُمْ ۗ أَوْ يُحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ط قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ ۗ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ط وَ
اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۷۳) ۗ

ترجمہ: اور اپنے دین کے پیرو کے سوا کسی اور کا قائل نہ ہونا (اے پیغمبر)
کہ دو کہ ہدایت تو خدا ہی کی ہدایت ہے (وہ یہ بھی کہتے ہیں) یہ بھی (نہ ماننا)
کہ جو چیز تم کو ملی ہے ویسی کسی اور کو ملے یا وہ تمہیں خدا کے روبرو قائل و
معقول کر سکیں گے یہ بھی کہ دو کہ بزرگی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے
چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا کشائش والا (اور) علم والا ہے۔ (۷۳:۳)

لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ إِلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ
اللَّهِ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ ذُو
الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۲۹) ۴

ترجمہ: (یہ باتیں) اس لیے (بیان کی گئی ہیں) کہ اہل کتاب جان لیں کہ
وہ خدا کے فضل پر کچھ قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ خدا کا فضل خدا ہی کے ہاتھ
میں ہے۔ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے۔ (۲۹:۵۷)

بشر، انسان اور آدم

”بہ حیثیت ایک ذی روح، انسان کی آفرینش کا جہاں ذکر آیا ہے، قرآن

پاک نے اس کے لیے 'بشر' اور 'انسان' کے الفاظ استعمال کیے ہیں 'آدم' کا لفظ استعمال نہیں کیا لفظ آدم سے مقصود تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ انسان کے اندر نیابت الہیہ کی صلاحیت موجود ہے۔" (تشکیلِ جدید، ص ۱۲۵)

آیات سورہ بقرہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ
قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۗ
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ (۳۰) وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰٓؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِينَ (۳۱)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کا نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں (خدا نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اس نے (آدم کو سب چیزوں کے) نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا اگر سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ (۲: ۳۰، ۳۱)

قرآن مجید میں قصہ آدم کا مقصد

یہ ساری بحث قرآن مجید میں بیان کردہ قصہ آدم کے حوالے سے ہے اور اس میں قرآن کا نقطہ نظر بیان کیا ہے اس طرح کے قصص بیان کرنے کا مقصد علامہ کے نزدیک کسی عالم گیر حقیقت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

”قرآن مجید میں جب کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے مقصد بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعے کا ذکر کیا جائے۔ اس سے عام طور پر کوئی

عالم گیر اخلاقی سبق دیا جاتا یا کوئی عالم گیر فلسفیانہ حقیقت اُجاگر کی جاتی ہے۔ لہذا قرآن پاک نہ تو افراد کے ناموں کا ذکر کرتا ہے نہ مقامات کا۔“

(تشکیل جدید۔ ص ۱۲۳)

”قرآن پاک کا اس قصے سے کچھ اور ہی مقصد ہے۔ لہذا قرآن پاک نے وہ تمام اسمائے معرفہ حذف کر دیئے ہیں جو عہد نامہ عتیق کی اس روایت میں مذکور ہیں۔ آدم، حوا تا کہ اس کی نگاہیں جس حقیقت پر ہیں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۲۶)

یہاں سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۱ پیش کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ ۚ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ ۗ لَمۡ تَكُنۡ مِّنۡ
السَّٰجِدِیْنَ (۱۱)

ترجمہ: اور ہم نے تم کو (ابتدا میں مٹی سے) پیدا کیا، پھر تمہاری صورت شکل بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو (سب نے) سجدہ کیا لیکن ابلیس نے، کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ (۷-۱۱)

تفسیر: خلق کا لغوی مفہوم کسی چیز کا خاکہ (design) بنانا ہے یہ لفظ قرآن میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اپنے دوسرے لوازم و متعلقات مثلاً بر، تسویہ، ترکیب اور تصویر کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جہاں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یہ اپنے تمام لوازم و متعلقات کے ساتھ آیا ہے جیسے یہاں۔ خلقنا کم کے بعد، صورنا کم بھی آیا ہے تو ایسے مواقع میں یہ اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے، یہاں خلق اور تصویر کے دو لفظوں نے تخلیق کی ابتدائی اور انتہائی حدیں واضح کر دیں، ہر مخلوق کا مرحلہ ابتدائی تو یہ ہے کہ اس کا خاکہ بنا اور اس

کا آخری تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اس کی صورت گری ہوئی ہے اور اس کے ناک نقشے اور نوک پلک درست ہوئے۔

یہاں مخاطب جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، قریش ہیں اور بیان ان کے سامنے انسانی تخلیق اور ان آزمائشوں کا ہو رہا ہے جو انسان کے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت آدمؑ تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اس وجہ سے ان کی سرگزشت تنہا انھی کی نہیں بل کہ پوری نسل انسانی کی سرگزشت ہے۔ (تدبر قرآن۔ جلد سوم۔ س ۲۳۰)

قصہ آدم کی حکایتیں

”قرآن مجید نے اس قصے کو دو الگ الگ حکایتوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک جس میں صرف ’الشجرہ‘ کا ذکر آیا ہے، دوسری وہ جس میں ’شجرۃ الخلد‘ اور ملک لایبلی کا۔ پہلی حکایت ساتویں اور دوسری بیسویں سورہ میں ملے گی۔“

(تشکیل جدید، ص ۱۲۶)

حوالہ سورہ۔ اعراف:

وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (۱۹)
ترجمہ: اور (ہم نے) آدم (سے کہا) تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو (اور جو چاہے) نوش جاں کرو مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ گناہ گار ہو جاؤ گے۔ (۱۹:۷)

سورہ طہ:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى (۱۲۰)

ترجمہ: تو شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ آدم بھلا میں تم کو (ایسا) درخت بتاؤں (جو) ہمیشہ کی زندگی کا (ثمرہ دے) اور (ایسی) بادشاہت کہ کبھی زائل نہ ہو (۱۲۰:۲۰)

زمین انسان کا مستقر

”عہد نامہ عتیق نے آدم کے جرم نافرمانی کی بنا پر زمین کو ملعون ٹھہرایا۔ برعکس اس کے قرآن مجید کے نزدیک وہ انسان کا مستقر اور متاع ہے، جس کے لیے اسے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۲۶)

یہاں مستقر و متاع کے حوالے سے حاشیے میں پہلے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۶ کا

حوالہ دیا گیا ہے۔

فَأَزَلُّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ص وَقُلْنَا
اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۳۶)

ترجمہ: پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس عیش و نشاط میں تھے اس سے اُن کو نکلوا دیا۔ تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانہ اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔ (۳۶:۲)

اس کے بعد دوسرا حوالہ سورہ اعراف سے دیا گیا ہے :

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ
مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲۴)

ترجمہ: (خدا نے) فرمایا (تم سب بہشت سے) اتر جاؤ (اب سے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے ایک وقت (خاص) تک زمین میں ٹھکانہ اور (زندگی کا) سامان (کر دیا گیا) ہے (۲۴:۷)

اس کے ساتھ ہی سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۰ دی گئی ہے (تشکیل میں ۹ ہے جو

درست نہیں۔)

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط
قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۱۰) ۴

ترجمہ: اور ہم ہی نے زمین میں تمہارا ٹھکانہ بنایا اور اس میں تمہارے لیے سامان معیشت پیدا کیے (مگر) تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ (۷-۱۰)

تفسیر: تمکین فی الارض سے مراد زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے (اور اسی طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے) ارض اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن خطاب چوں کہ قریش سے ہے اس وجہ سے اس سے مراد یہاں سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا، معاش سے اشارہ ان کی معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں، قرآن میں ان برکتوں اور نعمتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے۔ (تدبر قرآن، جلد سوم، ص ۲۲۸)

انگریزی متن میں یہاں مزید دو آیات کا حوالہ دیا گیا ہے :

وَالْأَرْضُ مَدَدْنَاهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَالْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ (۱۹) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (۲۰)

ترجمہ: اور زمین کو بھی ہم ہی نے پھیلا یا اور اس پر پہاڑ (بنا کر) رکھ دیے اور اس میں ہر ایک چیز اگائی۔ اور ہم نے تمہارے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن کو تم روزی نہیں دیتے، اس میں معاش کے سامان پیدا کیے۔

(۱۵:۱۹، ۲۰)

انسان زمین میں اجنبی نہیں

”پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ لفظ جنت (باغ) کا اشارہ یہاں اس فوق الحواس بہشت کی طرف ہے جس سے کہا جاتا ہے انسان زمین پر آگرا تھا۔ قرآن پاک نے کہیں نہیں کہا کہ انسان کی حیثیت اس میں اجنبی کی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۲۷) آیت سورہ نوح :

وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۱۷)

ترجمہ: اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے۔ (۷۱-۱۷)

تفسیر: یعنی تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمہیں موجودہ حالت پر لایا پہلے تم ماں اور باپ کی صلب میں الگ الگ نطفوں کی شکل میں تھے، پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمہارا استقرارِ حمل ہوا، پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بہ تدریج نشوونما دے کر تمہیں پوری انسانی شکل دی گئی اور تمہارے اندر تمام وہ قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمہیں درکار تھیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۱۰۲)

جنت کی تعریف؟

”یہ جنت جس کا اس قصے میں ذکر آیا ہے نیکو کاروں کا وہ مسکن نہیں جہاں ہمیشہ

رہتے چلے جائیں گے، کیوں کہ ان معنوں میں جہاں کہیں جنت کا ذکر آیا ہے

اس کی تعریف قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۲۷)

يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْتِيهِمْ (۲۳)

ترجمہ آیت: وہاں وہ ایک دوسرے سے جامِ شراب جھپٹ لیا کریں گے جس

(کے پینے) سے نہ ہڈیاں سرائی ہوگی نہ کوئی گناہ کی بات۔ (۲۳-۵۲)

تفسیر: یعنی شرابِ طہور کا دور چلے گا تو جنتی بہ طور خوش طبعی کے ایک دوسرے سے

چھینا چھپٹی کریں گے لیکن اس شراب میں محض نشاط اور لذت ہوگی، نشہ، بکواس اور فتور عقل وغیرہ

کچھ نہ ہوگا، نہ کوئی گناہ کی بات ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

مزید یہاں سورہ الحجر کی آیت نمبر ۲۸ بھی دی گئی ہے:

لَا يَسْتَهْمُونَ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ (۴۸)

ترجمہ: نہ ان کو وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں

گے۔ (۲۸:۱۵)

تفسیر: اور دنیا میں آپس میں جو کینہ وغیرہ تھا، ہم اس کو ان کے دلوں سے دور کر دیں

گے، آخرت میں سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے، ایک دوسرے کی زیارت کے لیے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے جنت میں ان کو ذرا بھی تکلیف اور مشقت نہ پہنچے گی۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۸)

تفسیر: حدیث میں ہے کہ جنتیوں سے کہا جائے گا کہ اے اہل جنت اب تمہارے لیے یہ ہے کہ ہمیشہ تندرست رہو، کبھی بیماری نہ ستائے، ہمیشہ زندہ رہو، کبھی موت نہ آئے، ہمیشہ آرام سے مقیم رہو، کبھی سفر کی تکلیف اٹھانی نہ پڑے۔ (تفسیر عثمانی)

قصہ آدم میں بیان کردہ جنت کا مفہوم

”لیکن وہ جنت جس کا ذکر اس قصے میں آیا ہے، اس میں تو انسان نے سب سے پہلے گناہ ہی کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا، دراصل قرآن مجید جہاں کہیں کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، وہیں اس کے معنی بھی بیان کر دیتا ہے چنانچہ آگے چل کر اسی قصے کی دوسری حکایت میں اسی باغ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۲۷)

سورہ طہ آیت ۱۱۸-۱۱۹

إِنَّ لَكَ الْأَلْبُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَى (۱۱۸) وَأَنْتَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَى (۱۱۹)

ترجمہ: یہاں تم کو یہ (آسائش) ہوگی کہ نہ بھوکے رہو نہ ننگے۔ اور یہ کہ نہ

پیا سے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ۔ (۱۱۸:۲۰-۱۱۹)

تفسیر: انسان کی یہ ہی بڑی ضرورتیں ہیں، کھانا پینا، پہننا اور رہنے کے لیے مکان جس میں دھوپ بارش کا بچاؤ ہو، جنت میں اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں، ہر طرح راحت ہی راحت ہے۔ ع بہشت آں جا کہ آزارے نباشد۔ یہاں راحت کا ذکر نہیں کیا گیا صرف تکلیفوں کی نفی کی شاید متنبہ کرنے کے لیے کہ یہاں سے نکلے تو ان سب چیزوں کی تکلیف اٹھاؤ گے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۲۲۶)

علامہ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں :

”اس لیے میں سمجھتا ہوں قرآن پاک کی اس روایت میں لفظ جنت کا اشارہ حیاتِ انسانی کے اُس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا اور جس میں وہ اس تکلیف دہ احساس سے بے خبر تھا جو اپنی ضروریات میں محتاجی کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے، لیکن جو گویا تمہید ہے تہذیب و تمدن کی۔ (تشکیلِ جدید، ص ۱۲۷)

ابتدائی جنت کا تصور :

”اور اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن پاک کی اس روایت میں لفظ جنت کا اشارہ حیاتِ انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا وہ اس تکلیف دہ احساس سے بے خبر تھا جو اپنے ضروریات میں محتاجی کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ گویا تمہید ہے تہذیب و تمدن کی۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۲۷)

انسان کا گناہ معاف کر دیا گیا

”یوں بھی قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں کہ کرہ ارض ایک دارِ لعذاب ہے جہاں انسان کا خمیر ہی بدی سے اٹھایا گیا ہے۔ کسی اولین گناہ کی پاداش میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ برعکس اس کے اس کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنے ارادے اور مرضی سے کیا اور یہی وجہ ہے کہ ارشادِ قرآنی کے مطابق آدم کا گناہ معاف کر دیا گیا۔“ (تشکیلِ جدید۔

ص ۱۲۸)

حوالہ سورہ بقرہ آیت ۳۷۔ تشکیلِ جدید کے حاشیے میں صرف آیت نمبر ۳۷ کا حوالہ

ہے لیکن انگریزی متن میں ۳۵، ۳۶، ۳۷ کا حوالہ ہے اور اس کے علاوہ سورہ کی آیت ۱۲۰، ۱۲۲ کا بھی حوالہ ہے۔

قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
 حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
 الظَّالِمِينَ (۳۵) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا
 فِيهِ ص وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَلَكُمْ فِي
 الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۳۶) فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ
 رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ط إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۳۷)

ترجمہ: اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں
 چاہو بے روک ٹوک کھاؤ (پھو) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو
 ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا
 دیا اور جس (عیش و نشاط) میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا، تب ہم نے حکم دیا
 کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے
 لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانہ اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔ پھر
 آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے قصور
 معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا (اور) صاحبِ رحم ہے۔

(۳۷:۲، ۳۶، ۳۷)

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ
 الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (۱۲۰) فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتَ لَهَا
 سَوَاتِحُهَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَ
 عَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (۱۲۱) ص ۗ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ
 عَلَيْهِ وَهَدَىٰ (۱۲۲)

ترجمہ: تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ آدم بھلا میں تم
 کو ایسا درخت بتاؤں (جو) ہمیشہ کی زندگی کا (ثمرہ دے گا) اور (ایسی
) بادشاہت کہ کبھی زائل نہ ہو۔ تو دونوں نے درخت کا پھل کھا لیا تو ان پر

ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور اپنے (بدنوں) پر بہشت کے پتے چپکانے لگے اور آدمؑ نے پرودگار کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب) سے بے راہ ہو گئے۔ پھر ان کے پرودگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔ (۲۰: ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲)

تفسیر: حضرت آدمؑ کو وہ کلمات سکھائے گئے اور انھوں نے سیکھ لیے یا ان کو بہ طور الہام بتائے گئے تاکہ یہ کلمات حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کے لیے توبہ کا ذریعہ ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی کو معاف کر دیا اور جو شخص بھی توبہ کی حالت میں مرجائے اللہ تعالیٰ اس کی غلطی معاف کرنے والے ہیں۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد اول۔ ص۔ ۴۷)

انسان کی تخلیق، احسن تقویم، اسفل السافلین

” اگر انسان خیر کا انتخاب کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی شر کا انتخاب کر لے۔ لہذا اگر مشیت ایزدی یوں ہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے، اندریں صورت انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد پر پورا اترے، یوں بھی جس ہستی کی تخلیق احسن تقویم،، پر ہوئی، مگر جسے پھر اسفل السافلین میں لوٹا دیا گیا“ (تشکیل جدید، ص۔ ۱۲۹) حوالہ۔

(آیت سورہ والتین۔)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۴) زُتْمَ رَكَدَانِهِ
أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۵)

ترجمہ: ہم نے انسان کو کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے، پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست کر دیا۔ (۹۵-۴، ۵)

تفسیر: ہم نے انسان کو کو بہت خوب صورت سانچے میں ڈھالا ہے اور پھر ہم آخرت میں اس کو دوزخ میں داخل کر دیں گے، مثلاً ولید بن مغیرہ اور کلدہ کافر، یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اولادِ آدم کو عمدہ سانچے میں ڈھالا ہے پھر وہ اپنی جون پوری کر لیتا ہے تو اسے پستی کی عمر کی

طرف لوٹا دیتے ہیں اب وہی نیکیاں کارآمد ہوتی ہیں جو وہ اپنی جوانی میں کر چکا ہوتا ہے۔
(تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۲۸۳)

انسان کی مخفی قوتوں کی تربیت

اس کی (انسان کی) مخفی قوتوں کی تربیت کچھ یوں ہی ممکن تھی کہ اس طرح کا خطرہ
(جو اوپر بیان ہوا ہے) برداشت کر لیا جاتا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے (تشکیل جدید۔ ص ۱۲۹)
(یہاں سورہ انبیاء کی آیت ۳۵ کا ایک حصہ دیا گیا ہے، تشکیل جدید میں ۳۶ درست نہیں)
كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ط وَ نَبَلُوْكُمْ بِالْاَشْرِّ وَالْاِحْسَنِ ط
ط وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۳۵)

پوری آیت کا ترجمہ: ہر تنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اور ہم تم لوگوں کو سختی
اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر
آو گے۔ (۲۱-۳۵)

تفسیر: یہ آیت مبارکہ کفار کے جواب کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ بد بخت آپ
کے انتقال فرما جانے کے منتظر تھے اور اس کی خوشیاں مناتے تھے، موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں
سے ہر جان دار موت کا مزہ چکھے گا اور ہم تمہیں سختی اور فراخی سے آزماتے ہیں، یہ دونوں باتیں
اللہ کی طرف سے آزمائش ہیں اور مرنے کے بعد پھر تم سب ہماری طرف چلے آو گے اور ہم
تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دین گے۔

آدم کی فرشتوں پر برتری

”پہلی حکایت کے سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ
قرآن مجید میں جب اس پہلو سے کہ آدم کو اشیا کے نام معلوم ہیں، فرشتوں
پر اس کی برتری ظاہر کی گئی۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۲۹، ۱۳۰)

یہاں انگریزی متن میں سورہ البقرہ کی دو آیات کا حوالہ ہے:

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

فَقَالَ اَنْبِئُونِي بِاَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱)
 قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ
 الْحَكِيْمُ (۳۲) قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ ۗ فَلَمَّۤا اَنْبَاَهُمْ
 بِاَسْمَائِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيۡۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ
 الْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳) وَ
 اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّا اِبْلِیْسَ ۗ اَبٰی
 وَاسْتَكْبَرَ زَقٰۤىۤا وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴)

ترجمہ: اور اس نے (آدم کو سب چیزوں کے) نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں
 کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے
 کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں
 تو (دانا اور) حکمت والا ہے۔ (تب) خدا نے (آدم) حکم دیا کہ آدم تم ان
 (چیزوں) کے نام بتاؤ، جب انھوں نے ان کے نام بتائے تو (فرشتوں سے
) فرمایا کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی
 (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو
 ہر چیز مجھ کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ
 کرو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر
 بن گیا۔ (۲: ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴)

ہبوطِ آدم کی دوسری حکایت

”ان آیات میں جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر آئے ہیں، یہ ظاہر کرنا
 مقصود تھا کہ علم انسانی کی نوعیت تصوری ہے۔ دوسری یہ کہ مادام تساوانے
 جنہیں قدیم رمزیت و اشاریت پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ اپنی کتاب
 عقیدہ مخفیہ میں بتایا ہے کہ قدام کے نزدیک شجر راز کی علامت تھا جسے علوم خفیہ
 کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لہذا آدم کو درخت کا پھل چکھنے سے روکا گیا تو

اس لیے کہ بہ سبب اپنی متناہیت ذات، علیٰ ہذا بہ سبب ان اعضاءِ حس کے جو اسے عطا ہوئے، اور ایسے ہی بہ سبب اپنی ذہنی قوتوں کے وہ ایک دوسری قسم کے علم کا اہل تھا، یعنی اس علم کا جو نتیجہ ہے صبر آزما مشاہدے کا اور جس میں رفتہ رفتہ ہی اضافہ ممکن۔ لیکن شیطان نے اسے ورغلا یا کہ علم خفی کے شجر ممنوعہ کا پھل چکھے اور آدم اس کے ورغلانے میں آ گیا۔ اس لیے نہیں کہ شر اس کی سرشت میں داخل ہے بل کہ اس لیے کہ وہ فطرتاً عجول ہے۔“

(تشکیل س ۱۳۰)

یہاں لفظ عجول کے حوالے سے حاشیے میں دو آیات کا حوالہ دیا ہے :

وَيَدْعُ الْإِنْسَانَ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ط وَ كَانَ الْإِنْسَانُ
عَجُولًا (۱۱)

ترجمہ: اور انسان اس طرح (جلدی سے) بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا اور انسان جلد باز (پیدا ہوا) ہے۔ (۱۱:۱۷)

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا
تَسْتَعْجِلُونِ (۳۷)

ترجمہ: انسان (کچھ ایسا جلد باز ہے کہ گویا) جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے، میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا تو تم جلد بازی نہ کرو۔

(۳۷:۲۱)

اسی حاشیے میں ایک تفصیلی نوٹ دیا گیا ہے جس میں دو آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن

کا ترجمہ پہلے شامل کر لیا گیا ہے۔

قصہ آدم میں تشکیل کی مزید عبارت

وہ چاہتا ہے کہ علم کی منزلیں عجلت میں طے کر لے، لہذا اس کا یہی رجحان ہے جس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ اس کی پرورش کسی ایسے ماحول میں ہو جہاں دکھ درد کی تکلیف کے باوجود اسے اپنی ذہنی قوتوں کے اظہار کا موقع ملتا رہے۔ گویا آدم کو

ایک تکلیف دہ ماحول میں رکھا گیا تو سزا کے طور پر نہیں بل کہ شیطان کے ارادوں کو شکست دینے کے لیے، جو انسان کا دشمن ہے اور جس نے کمال سیاست سے کوشش کی کہ اسے مسلسل نشوونما اور افزائش ذات کی لذتوں سے محروم کر دے۔ اب ایک متزاحم ماحول میں نفس متناہیہ کی زندگی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ خود اپنے تجربات کی بدولت اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ مگر پھر نفس متناہیہ کے ان تجربات میں جس کے سامنے ایک نہیں کئی امکانات ہوں، وسعت پیدا ہوگی تو امتحان اور آزمائش، غلطی اور خطا کے ذریعے، لہذا غلطی یا خطا بھی، باوجودیکہ اس کو ہمیں ایک قسم کے ذہنی شر سے تعبیر کرنا پڑے گا، حصول تجربات میں ناگزیر ہے، رہی ہبوط آدم کے سلسلے میں قرآن مجید کی دوسری حکایت، سو اس کا بیان اس طرح آیا ہے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۳۰)

اس طویل اقتباس کے بعد علامہ نے سورہ طہ کی آیات ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱ کا حوالہ دیا

ہے۔

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ
الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى (۱۲۰) فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتَ لَهُمَا
سَوَاتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ دَرَقِ الْجَنَّةِ ذُو
عَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى (۱۲۱) ص ۱۲۱ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ
عَلَيْهِ وَهَدَاهُ (۱۲۲)

ترجمہ: تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا آدم بھلا میں تم کو
(ایسا) درخت بتاؤں (جو) ہمیشہ کی زندگی کا (ثمر دے) اور (ایسی)
بادشاہت کہ کبھی زائل نہ ہو۔ تو دونوں نے اس کا پھل کھا لیا تو ان پر ان کی
شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے (بدنوں) پر بہشت کے پتے چپکانے
لگے اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب
سے) بے راہ ہو گئے پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے
توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتلائی۔ (۲۰-۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲)

تفسیر: اگرچہ آدم علیہ السلام کا یہ عمل شرعی قانون کی رو سے گناہ میں داخل نہیں تھا لیکن آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور مقربین خاص میں سے ہیں اس لیے ان کی ادنی لغزش کو بھی بھاری لفظوں میں عصیان کہہ کر تعبیر کیا گیا اور اس پر عتاب کیا گیا اور لفظ غوی دو معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک معنی زندگی کے تلخ ہو جانے اور عیش خراب ہو جانے کے ہیں۔ دوسرے گم راہ ہو جانے یا غافل ہو جانے کے، ائمہ تفسیر۔ قشیری، اور قرطبی وغیرہ سے اس جگہ لفظ غوی کے پہلے معنی ہی کو اختیار کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا، زندگی تلخ ہو گئی۔ (معارف القرآن۔ جلد ششم۔ ص ۱۲۶)

۲۔ یعنی جب حکم الہی کے امتثال میں غفلت و کوتاہی ہوئی تو اپنی شان کے موافق عزم و استقامت کی راہ پر ثابت قدم نہ رہے، اسی کو غواہیت و عصیان سے تغلیظاً تعبیر فرمایا۔ یعنی شیطان کا تسلط نہیں ہونے دیا، بل کہ فوراً توبہ کی توفیق بخشی۔ خلعت قبول سے نوازا اور بیش از بیش مہربانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی خوش نودی کے راستہ پر قائم کر دیا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۲۷)

”اب زندگی عبارت ہے ایک مخصوص اور معین شکل و ہیت، علیٰ ہذا ایک موجود و محسوس انفرادیت سے جس کا اظہار لا تعداد شکلوں میں ہو رہا ہے اور جن میں ذات حقیقی اپنے وجود کی لامتناہی وسعتوں کا انکشاف کر رہی ہے۔ لیکن پھر اس طرح کی انفرادیتوں کا پے در پے ظہور اور افزائش جن میں ہر ایک کی نظر اس بات پر ہے کہ اپنے ہی ممکنات کو بروئے کار لائے اور اپنے ہی غلبے کی سعی کرے، اس خوف ناک جدوجہد کا سرچشمہ بھی ہے جو قرن ہا قرن سے جاری ہے ارشاد قرآنی بھی یہی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۳۲)

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ص وَقُلْنَا
اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَمَا تَعَاوَىٰ إِلَىٰ حِينٍ (۳۶)

ترجمہ: پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس (عیش و نشاط)

میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا، تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانہ اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔ (۳۶:۲)

انگریزی متن میں یہاں مزید دو آیات کا حوالہ دیا گیا ہے :

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲۴)

ترجمہ: (خدا نے) فرمایا (تم سب بہشت سے) اتر جاؤ (اب سے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے ایک وقت (خاص) تک زمین میں ٹھکانہ اور (زندگی کا) سامان (کر دیا گیا) ہے (۲۴:۷)

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَبِيحًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۖ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۱۲۳)

ترجمہ: فرمایا کہ تم دونوں یہاں سے نیچے اترو۔ تم میں بعض بعض کے دشمن (ہوں گے) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گم راہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

(۱۲۳:۲۰)

امانت کا تصور

”لہذا ان باہم دگر متخالف اور متزاحم افرادیتوں کا یہی تصادم وہ عالم گیر دکھ درد ہے جس سے اس کی چند روزہ زندگانی کا راستہ تاریک بھی ہو جاتا ہے اور منور بھی۔ لیکن انسان کے معاملے میں تو زندگی کی اس الم ناک داستان نے جس کی انفرادیت پختہ در پختہ ہو کر شخصیت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس کے لیے خطا اور غلطی کے ایک نہیں کئی راستے ہیں اور بھی درد انگیز شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر پھر زندگی کو بہ طور ایک ذات یا خودی کے قبول کرنا ان

سب خامیوں کو قبول کرنا ہے جو اس کی تنہایت سے پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ شخصیت کا یہ بارِ گراں ایک امانت ہے جسے آسمانوں اور پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا مگر جسے انسان نے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اٹھایا۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۳۲)

یہاں علامہ نے سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۳ کا حوالہ دیا ہے :

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ
فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ
كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۷۲)

ترجمہ: ہم نے بارِ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اُسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ (۷۲-۷۳)

تفسیر: اور ہم نے بارِ امانت یعنی اطاعت و عبادت آسمان والوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے علی وجہ الاختیار و التخصیص پیش کی تھی تو انھوں نے خوفِ عذاب کی وجہ سے احتمالِ ثواب سے بھی دست برداری کی اور اس کی ذمہ داری لیتے ڈر گئے اور (انسان) حضرت آدم نے بہ وجہ اس ثواب و عذاب کے اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لے لیا وہ اس ذمہ داری لینے میں یا یہ کہ درخت میں سے کھانے کے بارے میں ظالم اور اس کے انجام سے لاعلم تھے۔ (تفسیر ابن عباس، ص ۷۰)

تفسیر: میرے خیال میں یہ امانت ایمان و ہدایت کا ایک تخم ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیرا گیا، جس کو ماہِ التکلیف بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اسی نگہ داشت اور تردد کرنے ایمان کا درخت اگتا ہے، گویا بنی آدم کے قلوب اللہ کی زمینیں ہیں بیج بھی اسی نے ڈال دیا ہے بارش برسانے کے لیے رحمت کے بادل بھی اسی نے بھیجے جن کے سینوں میں وحی الہی کی بارش ہوئی، آدمی کا فرض یہ ہے کہ ایمان کے اس بیج کو جو امانت الہیہ ہے ضائع نہ ہونے دے بل کہ پوری سعی و جہد اور تردد و تفقہ سے اس کی پرورش کرے، مبادا غلطی یا غفلت سے بجائے

بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ
 حِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ
 الْمُتَّقُونَ (۱۷۷)

ترجمہ: نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر
 لو بل کہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر اور (خدا کی) کتاب پر اور
 پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں
 اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے
 چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر
 لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کا رزار کے وقت
 ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو
 (خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔ (۱۷۷:۲)

انگریزی متن میں مزید ایک آیت کا حوالہ ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا
 اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۲۰۰) ۚ

ترجمہ: اے اہل ایمان (کفار کے مقابلے میں) ثابت قدم رہو اور
 استقامت رکھو اور (مورچوں پر) جمے رہو اور خدا سے ڈرو تا کہ مراد حاصل
 کرو۔ (۲۰۰:۳)

”یہ دوسری بات ہے کہ ارتقائے ذات کے جس مرحلے سے ہم اب گزر
 رہے ہیں، اس میں ضبط تو نظم کا حقیقی منشا سمجھنے سے قاصر ہیں جو دکھ درد کے
 پیش نظر مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے اس سے مقصود یہ ہو کہ ہم اپنی
 خودی میں استحکام پیدا کریں اور یوں ہلاکت اور فنا سے محفوظ رکھیں۔ لیکن پھر
 یہی مرحلہ جس میں ہم فکر محض کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، کیوں کہ یہیں
 پہنچ کر ہمارا یہ ایمان کہ انجام کار غلبہ خیر ہی کو ہوگا، ایک مذہبی عقیدے کی شکل

اختیار کر لیتا ہے۔“ (تشکیل جدید - ۱۳۳) یہاں سورہ یوسف کی آیت ۲۱

کے آخری حصے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پوری آیت یہ ہے :

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ
عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۗ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ
فِي الْأَرْضِ ۖ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۗ وَاللَّهُ
غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ ۖ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۱)

ترجمہ: اور مصر میں جس شخص نے اس کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے (جس کا نام زلیخا تھا) کہا کہ اس کو عزت و اکرام سے رکھو، عجب نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ اس طرح ہم نے یوسف کو سرزمین (مصر) میں جگہ دی اور غرض یہ تھی کہ ہم ان کو (خواب کی) باتوں کی تعبیر سکھائیں۔ اور خدا اپنے کام میں غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۱۲-۲۱)

حقیقت دعا

”لہذا دعا خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف و تجسس کا عدیم المثال عمل ہے جس میں طالب حقیقت کے لیے نفی ذات ہی کا لمحہ اثبات ذات کا لمحہ بن جاتا ہے اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر، بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں سچ سچ ایک فعال عنصر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفس انسانی کی اس روش کے پیش نظر جو دعا میں اختیار کی جاتی ہے، اسلام نے صلوٰۃ میں نفی و اثبات دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی۔ مگر پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ دعایا عبادت کا تعلق دراصل انسان کے باطن اور ضمیر سے ہے اور اس لیے اس کی شکلیں بھی، جیسا کہ تاریخ سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مختلف، اسلام کا کہنا ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۳۹)

یہاں جو آیات دی گئی ہیں تشکیلِ جدید میں ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ تاہم یہ سورہ

الحج کی آیات، ۶۷، ۶۸، ۶۹ ہیں :

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُكَ فِيهِ
الْأَمْرَ وَأَدْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۗ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٌ (۶۷) وَ
إِنْ جَدَلُواكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ (۶۸) اللَّهُ
يُحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۶۹)
ترجمہ: ہم نے ہر ایک امت کے لیے ایک شریعت مقرر کر دی ہے کہ جس پر
وہ چلتے ہیں تو یہ لوگ تم سے اس امر میں جھگڑا کریں اور تم (لوگوں) اپنے
پروردگار کی طرف بلا تے ہو، بے شک تم سیدھے رستے پر ہو۔ اگر یہ تم سے
جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ جو تم عمل کرتے ہو، خدا ان سے خوب واقف ہے۔

(۶۹، ۶۸، ۶۷-۲۲)

تفسیر: تمام انبیاءِ اصول دین میں متفق رہے ہیں، البتہ ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ
نے بندگی کی صورتیں مختلف زمانوں میں مختلف مقرر کی ہیں، جن کے موافق وہ امتیں خدا کی
عبادت بجالاتی ہیں، اس امتِ محمدیہ کے لیے بھی ایک خاص شریعت بھیجی گئی لیکن اصل دین
ہمیشہ ایک ہی رہا۔ بہ جز اللہ کے کبھی کسی دوسری چیز کی عبادت مقرر نہیں کی گئی اس لیے توحید
وغیرہ کے متفق علیہ کاموں میں جھگڑا کرنا کسی کو کسی حال میں زیبا نہیں، جب ایسی کھلی ہوئی چیز
میں بھی جھگڑیں نکالی جائیں گی تو آپ کچھ پروا نہ کریں، آپ جس سیدھی راہ پر قائم ہیں لوگوں کو
اسی طرف بلا تے رہیے اور خواہ مخواہ جھگڑا نکلنے والوں کا معاملہ خدا کے سپرد کیجیے وہ خود ان تمام
حرکات سے واقف ہے۔ قیامت کے دن ان کے تمام اختلافات اور جھگڑوں کا عملی فیصلہ کر
دے گا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۵۳)

عبادت کی شکل قابلِ بحث امر نہیں

”لہذا عبادت کی شکل کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس سے ہم انسانوں میں بحث و

نزاع کا دروازہ کھل جائے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۳۹)

یہاں انگریزی متن میں سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (لیکن یہ آیت اس سے متعلق نظر نہیں آتی)

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ قَفْ وَ مَا اخْتَلَفَ الدِّينَ
أَوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مَنۢ بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ
وَ مَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹)

ترجمہ: دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے اور اہل کتاب نے جو (اس دین سے) اختلاف کیا تو علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا۔ اور جو شخص خدا کی آیتوں کو نہ مانے تو خدا جلد حساب لینے والا اور (سزا دینے والا) ہے۔ (۱۹:۳)

”کیوں کہ جہاں تک اس کی روح کا تعلق ہے، یہ غیر ضروری سی بات ہے کہ اس میں ہم نے اپنا منہ کس طرف پھیرا۔ قرآن مجید کا واضح اور صاف و صریح ارشاد ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۳۹)

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ق فَأَيْنَمَا تُولُوْا فَنَّمَّ وَجْهُ اللَّهِ ط
إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۱۱۵)

ترجمہ: اور مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے، تو جدھر تم رخ کرو ادھر خدا ہی کی ذات ہے بے شک خدا صاحب وسعت اور باخبر ہے۔ (۱۱۵-۲)

تشکیل میں حوالہ ۲-۵۲ ہے جو درست نہیں۔

تفسیر: اب اللہ تعالیٰ قبلہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ کہ جس شخص کو قبلہ معلوم نہ ہو وہ سوچ

بچا کر کے جس جانب نماز میں اپنا چہرہ کر لے تو وہ نماز اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے ہو جائے گی، اور اس آیت کی تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب والوں کا قبلہ بیان کر رہا ہے اور وہ حرم ہے۔ تو جس مقام پر بھی نماز کی حالت میں تم اپنے چہاروں کو حرم کی طرف کر لو گے تو وہ اللہ تعالیٰ کا قبلہ ہے، اللہ تعالیٰ قبلہ کے تعلق سے ان کی نیتوں سے واقف ہے۔

(تفسیر ابن عباس، جلد اول، ص ۱۷۷)

اس کے بعد سورہ البقرہ کی آیت ۷۷ ادی ہے :

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ
الْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَ
الْيَتَامَىٰ وَالسُّكَّانَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ ۚ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ
بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ
حِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۗ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُونَ (۱۷۷)

ترجمہ: نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو، بل کہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا کی ذات پر اور آخرت پر اور (خدا کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں خدا سے ڈرنے والے۔ (۲-۱۷۷)

تفسیر: نیکیاں اور ایمان صرف اس کا نام نہیں کہ تم نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر لو، ایمان تو اقرار اور تصدیق کا نام ہے اور نیکو کار وہ مومن ہے جو اللہ تعالیٰ پر مرنے کے بعد زندگی پر اور تمام کتابوں پر اور تمام انبیائے کرام پر ایمان لائے۔ اور ایمان لانے کے بعد جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں اب اللہ تعالیٰ ان کا ذکر کرتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد اصل نیکی یہ ہے کہ مال کی کمی اور خواہش کے باوجود اللہ تعالیٰ کی محبت میں رشتہ داروں اور مومن یتیموں اور مساکین کو جو مانگتے نہیں اور ایسے مسافروں کو جو بطور مہمان کے آیا ہو اور سوال کرنے والوں کو

اور مجاہدین کو اور غلاموں کی آزادی میں اپنا مال دے اور ان واجبات و احکام کے بعد احکام شرعیہ لوگوں پر لازم ہوتے ہیں۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲، ۱۰۳)

..... عبدالرزاق بواسطہ معمر۔ قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے اور نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ نیکی اسی چیز کا نام نہیں کہ مغرب یا مشرق کی طرف اپنا منہ پھیر لو۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد اول۔ ص ۱۰۳)

اسلام میں عبادت کی مخصوص سمت اور اس کی ظاہری شکل

”اسلام نے عبادت کے لیے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موجزن ہوں، بعینہ جس طرح اس کی ظاہرہ شکل سے مساوات اجتماعی کی حس بیدار ہوتی اور پرورش پاتی ہے، کیوں کہ صلواہ باجماعت سے مقصود ہی یہ ہے کہ شرکائے جماعت میں اپنے مقام و مرتبہ یا نسلی حیثیت کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔ نوع انسانی ایک ہے اس لیے وہ محیط برکل ذات جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے اور اس کا سہارا ایک ہے لہذا قرآن مجید نے نسل اور قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم کو تعارف کا ایک ذریعہ ٹھہرایا۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۴۰) حاشیے میں سورہ الحجرات کی آیت نمبر ۱۳ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتِّقَاكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۱۳)

ترجمہ: لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔ (۱۳-۴۹)

تفسیر: ابن ابی حاتم نے ابن ابی ملیکہ سے روایت کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت بلال خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھے اور آذان دی تو اس پر بعض لوگ کہنے لگے، کیا یہ سیاہ غلام بیت اللہ کی چھت پر آذان دیتا ہے تو اس پر ان میں سے بعض نے کہا کہ یہ اپنے علاوہ دوسرے سے اللہ کو ناراض کر دے گا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۲۷۶)

خطبات کی اس عبارت کے حوالے سے انگریزی متن میں مزید تین آیات کے حوالے دیے گئے ہیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قَفَّ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ
مُنذِرِينَ ص وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ
النَّاسِ فِي مَا اُخْتَلَفُوا فِيهِ ط وَ مَا اُخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ
أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ه فَهَدَى
اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لَنَا اُخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِأَذْنِهِ ط وَ
اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲۱۳)

ترجمہ : (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈرسانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور پر اختلاف کرتے تھے ان کا ان میں فیصلہ کر دے اور اس میں اختلاف بھی ان ہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی، باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آچکے تھے (اور اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا) تو جس امر حق میں اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو راہ دکھادی اور خدا جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔

(۲۱۳:۲)

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط وَلَوْ لَا كَلِمَةُ

سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لِقَضَىٰ بَيْنَهُمْ فِينَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۹)
 ترجمہ: اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت تھے (یعنی ایک ہی ملت پر)
 تھے پھر جدا جدا ہو گئے اور اگر ایک بات اگر جو تمہارے پروردگار کی طرف
 سے پہلے ہو چکی ہے نہ ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں ان میں
 فیصلہ کر دیا جاتا۔ (۱۹:۱۰)



خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت

The Human Ego, His Freedom and Ammortality

قرآن نے انسان کی انفرادیت پر زور دیا ہے، قرآنی نقطہ نگاہ سے نہ تو ایک انسان دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے نہ یہ ممکن ہے کہ اپنی کوشش سے زیادہ ملے، خودی ایک حقیقت ہے اور اگر ایک عمیق اور پختہ شخصیت پیدا کر لی جائے تو روحانی طور پر ثبات اور استحکام حاصل کر سکتی ہے، قرآن حکیم کے نزدیک ایسی واردات علم کا ذریعہ ہیں۔ خدا کی تخلیقی فعلیت کے دو پہلو ہیں خلق جس کے معنی پیدا کرنے کے اور امر جس کے معنی ہدایت کے ہیں۔ قرآن حکیم واضح کرتا ہے کہ دونوں قسم کی تخلیق یعنی خلق اور امر خدا کے ہاتھ میں ہے روح کی حقیقی ماہیت کا اظہار اصطلاح امر ہی سے کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ آزادی و اختیار کی قدرت خودی کی زندگی کا مستقل عنصر بن جائے، سو خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے اس کا ہر عمل ایک نیا موقف پیدا کرتا ہے اور یوں انسان کو اپنی خلاتی، دریافت، ایجاد اور طباعی کے لیے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق اس بات کا امکان ہے کہ بعض انسان کائنات کے مقاصد میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں مگر کائنات کے مقاصد میں وہی حصہ لے سکتے ہیں جو اپنے افعال و اعمال کی شیرازہ بندی اس طور پر کریں کہ ان کی خود مستحکم ہو جائے اور وہ موت کے صدمے سے محفوظ رہیں۔ حیات بعد الموت انسان کا حق نہیں بل کہ اس کے لیے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانا پڑتا ہے اور اس کی تحصیل کا دار و مدار مسلسل جدوجہد پر ہے۔ جنت اور دوزخ کسی جگہ کا نام نہیں، انسان کے احوال ہیں۔ نہ جنت عیش و آرام کی کوئی حالت ہے اور نہ جہنم مستقل ازیت کا کوئی گڑھا، حیات ایک تسلسل ہے اور انسان خدا کی نو

بہ نوجلیات کے لیے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔ (ملخص۔ زندہ رود، جلد سوم، ڈاکٹر جاوید اقبال، ص ۳۷۶، ۳۷۷)

”قرآن نے ایک تو انسان کی انفرادیت اور یکتائی پر بڑے ہی سادہ اور موثر انداز میں زور دیا ہے اور پھر جیسا کہ میں سمجھتا ہوں وہ اس لحاظ سے کہ زندگی ایک وحدت ہے۔ اس کی تقدیر کا ایک خاص نظریہ قائم کرتا ہے لہذا بہ حیثیت ایک یکتا انفرادیت، انسان کے بارے میں اس کا یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر نہ تو کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ اسے اپنی کوشش کے سوا کچھ ملے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۴۲)

اس موقع پر حاشیے میں دونوں آیات نقل کی گئی ہیں جو سورہ وانجم کی آیات نمبر ۳۸ اور

۳۹ ہیں۔

(تشکیل جدید کے حاشیے میں یہی دو آیات دی گئی ہیں البتہ اس عبارت کے حوالے

سے انگریزی متن میں مزید آیات دی گئی ہیں پہلے ان کا ترجمہ دیا جاتا ہے)

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمَا خَوْلَانِكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۗ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمْ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۗ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۹۴)

ترجمہ: اور جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا ایسا ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے اور (مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے (شفیع اور ہمارے) شریک ہیں (آج) تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے اور جو

دعوے تم کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔ (۹۴:۶)

وَأَنذَرْتَهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا (۸۰)

ترجمہ : اور جو چیزیں یہ بتاتا ہے ان کے ہم وارث ہوں گے اور یہ اکیلا
ہمارے سامنے آئے گا (۸۰:۱۹)

وَ كُلُّهُمْ اَتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (۹۵)

ترجمہ : اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں
گے۔ (۹۵:۱۹)

قُلْ اَغْيِرَ اللّٰهُ اَبْغِي رَبًّا وَ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ط وَ لَا
تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيَّهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى
ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ
تَخْتَلِفُونَ (۱۶۴)

ترجمہ : کہو کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں اور وہی تو ہر چیز کا
مالک ہے اور جو کوئی (برا) کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اس کو ہوتا ہے اور کوئی
شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی
طرف لوٹ کر جانا ہے تو جن جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے وہ تم کو
بتائے گا۔ (۱۶۴:۶)

مَنْ اهْتَدٰى فَاِنَّا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ؕ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ط وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى ط وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ
حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۵)

ترجمہ : جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے، تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور جو گم
راہ ہوتا ہے تو گم راہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں
اٹھائے گا اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔ (۱۵:۱۷)

وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى ط وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا
لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَتْ ذَاقِرْبٰى ط اِنَّا نُنذِرُ الَّذِيْنَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ط وَ مَنْ تَزَكٰى

فَإِنَّمَا يَتَزَكَّى لِنَفْسِهِ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۱۸)

ترجمہ : اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ ہٹانے کو کسی کو بلائے تو کوئی اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا اگرچہ قرابت دار ہی ہو۔ اے پیغمبر تم ان ہی لوگوں کو نصیحت کر سکتے ہو جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے اور نماز بالا التزام پڑھتے ہیں اور جو شخص پاک ہوتا ہے اپنے لیے ہی پاک ہوتا ہے اور (سب کو) خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (۱۸:۳۵)

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۷)

ترجمہ : اگر ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر شکر کرو گے تو وہ اس کو تمہارے لیے پسند کرے گا اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ تم کو بتائے گا۔ وہ تو دلوں کی پوشیدہ باتوں تک سے آگاہ ہے۔ (۷:۳۹)

تشکیل جدید میں دی گئی آیات

أَنْ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۳۸) وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۳۹)

ترجمہ: یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (۳۹، ۳۸-۵۳)

تفسیر: یعنی موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں کا یہ مضمون تھا کہ خدا کے ہاں کوئی مجرم

دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنا ہوگی۔۔۔۔۔ یعنی آدمی جو کچھ

کوشش کر کے کماتا ہے وہی اس کا ہے، کسی دوسرے کی نیکیاں لے اڑے یہ نہیں ہو سکتا، باقی کوئی خود اپنی خوشی سے اپنے بعض حقوق دوسرے کو عطا کر دے اور اللہ تعالیٰ اس کو منظور کر لے وہ الگ بات ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۷۰۰)

تصوف اور وارداتِ باطن کی وحدت

”یہ صرف تصوف تھا جس نے کوشش کی کہ عبادات اور ریاضت کے ذریعے وارداتِ باطن کی وحدت تک پہنچے قرآن پاک کے نزدیک یہ وارداتِ علم کا ایک سرچشمہ ہیں۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۴۴)

انگریزی متن میں یہاں دو آیات دی گئی ہیں

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَّبِعُوْنَ لَهْمُ اِنَّهُ
الْحَقُّ ۝ اَوْلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اِنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳)
ترجمہ: عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی
اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن)
حق ہے کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز پر خبردار ہے۔ (۵۳:۴۱)
وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلسُّوْقِنِيْنَ (۲۰) ۝ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ ۝ اَفَلَا
تُبْصِرُوْنَ (۲۱)

ترجمہ: اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں
اور خود تمہارے نفوس میں۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔ (۵۱: ۲۰-۲۱)

انسان خدا کا برگزیدہ ہے

”قرآن پاک نے کفارے کا تصور رد کر دیا، چنانچہ تین باتیں ہیں جو
از روئے قرآن واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ اول یہ کہ انسان خدا
کا برگزیدہ ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۴۲) حوالہ آیت سورہ طہ آیت ۱۲۲
ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (۱۲۲)

ترجمہ: پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور
سیدھی راہ بتلائی۔ (۱۲۲-۲۰)

تفسیر: یعنی حکمِ الہی کے امتثال میں غفلت و کوتاہی ہوئی تو اپنی شان کے موافق
عزم و استقامت کی راہ پر ثابت قدم نہ رہے، اسی کو غوایتِ عصیان سے تغلیظ فرمایا۔ یعنی
شیطان کا تسلط نہیں ہونے دیا بل کہ فوراً توبہ کی توفیق بخشی، خلعت قبول سے نوازا اور بیش از بیش
مہربانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی خوش نودی کے راستے پر قائم کر دیا۔ (تفسیر عثمانی، ص
۴۲۷)

۲۔ ”ثانیاً یہ کہ باوجود اپنی خامیوں کے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔“ حوالہ آیت
سورہ البقرہ آیت ۳۰۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ
قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۗ
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ (۳۰)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے پروردگار نے
فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک نائب بنانے والا ہوں،
انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کا نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں
کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس
کرتے رہتے ہیں (خدا نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں
جانتے۔ (۲-۳۰)

تفسیر عثمانی۔ ملائکہ کو جب یہ خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق کہ جس میں مفسد اور خوں ریز
تک ہوں گے، ہم ایسے مطیع اور فرماں بردار کے ہوتے ہوئے خلیفہ بنانا، اس کی وجہ کیا ہوگی؟ تو
بہ طریق استفادہ سوال کیا، اعتراض ہرگز نہ تھا۔ رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیوں کر معلوم
ہوا۔ اس میں بہت سے احتمال ہیں۔ جنات پر قیاس کیا، یا حق تعالیٰ نے پہلے بتا دیا تھا، یا لوح

محفوظ میں لکھا دیکھا، یا سمجھ گئے کہ حاکم اور خلیفہ کی ضرورت جب ہی ہوگی جب ظلم و فساد ہوگا یا حضرت آدم کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۸)

سورہ الانعام۔ آیت ۱۶۵۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ
بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ
الْعِقَابِ ۚ ص لے وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶۵) ۴

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا، مہربان بھی ہے۔ (۶-۱۶۵)

تفسیر: یعنی خدا نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا کہ تم اس کے دیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر کیسے کیسے حاکمانہ تصرفات کرتے ہو، یا تم کو باہم ایک دوسرے کا نائب بنایا کہ ایک قوم جاتی ہے تو دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی ہے۔ یعنی تمہارے آپس میں بے حد فرق مدارج رکھا، چنانچہ شکل و صورت، رنگت، لہجہ، اخلاق و ملکات، محاسن و مساوی، رزق، دولت، عزت و جاہ وغیرہ میں افراد انسانی کے بے شمار درجات ہیں۔ یعنی ظاہر ہو جائے کہ ان حالات میں کون شخص کہاں تک خدا کا حکم مانتا ہے، ابن کثیر نے۔ فی ما آتاکم۔ سے وہ مختلف احوال و درجات مراد لیے ہیں جن میں حسب استعداد و لیاقت ان کو رکھا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۲۰۰)

۳۔ ”ثالثاً۔ یہ کہ وہ ایک آزاد شخصیت کا امین ہے جسے اس نے خود اپنے آپ کو

خطرے میں ڈال کر قبول کیا۔“

(حوالہ آیت سورہ احزاب۔ آیت ۷۲) اس آیت کا ترجمہ و تفسیر امانت کے تصور

کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

خودی کی ماہیت

”جب ہم کسی شے کا ادراک کرتے ہیں یا اس پر حکم لگاتے ہیں یا کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں خودی کی زندگی اطناب کی ایک حالت ہے جس کو اس نے اپنے ماحول پر اثر آفرینی یا اس سے اثر پذیری کی خاطر پیدا کر رکھا ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اثر آفرینی اور اثر پذیری کی اس کشمکش میں خودی کا وجود اس سے باہر رہتا ہے، ہرگز نہیں، برعکس اس کے وہ ایک راہ نما توانائی کی طرح اس میں شامل رہے گی، لہذا اسکے یہی تجربات اور واردات ہیں جس سے اس کی تشکیل اور اس کے نظم و ضبط کا راستہ کھلتا ہے قرآن مجید میں بھی اس راہ نما وظیفے کی طرف اشارہ موجود ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۵۴) حوالہ آیت، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۸۵

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ط قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۸۵)

ترجمہ: اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔

(۸۵-۱۷)

تفسیر: امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینے جا رہا تھا۔ آپ کھجور کی ایک چھڑی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ آپ کا گزر کچھ یہودیوں کے پاس ہوا وہ آپس میں کہنے لگے کہ ان سے کچھ پوچھو، چنانچہ وہ بولے کہ ہم سے روح کے بارے میں بیان کیجیے، آپ یہ سن کر کچھ دیر کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنا سر مبارک اُوپر کواٹھایا، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ وحی بند ہوگئی تو آپ نے فرمایا۔۔۔۔۔ آیت؟ اور امام ترمذی نے حضرت عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم اس شخص یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیں، یہودیوں نے کہا کہ آپ روح

کے بارے میں دریافت کرو۔ چنانچہ قریش نے آپ سے دریافت کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

تفسیر: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا جواب دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے، اس لیے کہ یہ معنی صرف اسی صورت میں لیے جاسکتے ہیں جب کہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور سلسلہ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لیا جائے ورنہ سلسلہ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو روح کو جان کے معنی میں لینے سے عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھ نہیں آتی کہ جہاں پہلے تین آیتوں میں قرآن کا نسخہ شفا ہونے اور منکرین قرآن پاک کے ظالم اور کافر نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلام الہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آگیا ہے کہ جان داروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟ یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن کریم تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم سے یہ لوگ روح یعنی ماخذ قرآن یا ذریعہ حصول قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ انھیں بتادو کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۴۰)

روح کی کنہ اور حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو بہت مشکل ہے۔ تاہم میرے نزدیک آیات قرآنیہ سے روح کے بارے میں چند نظریات پر صاف روشنی پڑھتی ہے۔ ۱۔ انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی چیز موجود ہے جسے روح کہتے ہیں وہ عالم امر کی چیز ہے اور خدا کے حکم اور ارادے سے فائض ہوتی ہے۔ ۲۔ روح کی صفات علم و شعور وغیرہ بتدریج کمال تک پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے بے حد تفاوت و فرق مراتب ہے۔ ۳۔ مگر اس کے یہ کمالات ذاتی نہیں وہاب حقیقی کے عطا کیے ہوئے ہیں اور محدود ہیں۔ ۴۔ کتنی ہی بڑی

کامل روح پر حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس وقت چاہے اس سے کمالاتِ سلب کر لے۔ تفسیر عثمانی، ص ۳۸۶)

خلق اور امر

”عربی زبان میں خوش قسمتی سے دو لفظ موجود ہیں ایک۔ خلق۔ اور دوسرا امر اور جو ان دونوں صورتوں کے لیے مخصوص ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خلاقیت کا اظہار ہم انسانوں پر ہو رہا ہے، خلق کے معنی، پیدا کرنا، اس کی ہدایت اور راہ نمائی، جب ہی تو قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ خلق اور امر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ (تشکیلِ جدید، ص ۱۵۵)

حوالہ آیت۔ سورہ اعراف۔ آیت۔ ۵۴

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ قَفٍ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ
يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُومِ مُسَخَّرَاتٍ
بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ
الْعَالَمِينَ (۵۴)

ترجمہ: دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔ (۵۴-۷)

(پوری آیت کا ترجمہ یوں ہے)۔ کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر جا ٹھہرا اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا سب اسی کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔ (۵۴:۷)

”پھر اوپر کی آیت میں بھی جس کا حوالہ ہم ابھی دے آئے ہیں روح کی حقیقی ماہیت کا اظہار لفظ امر ہی سے کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کا سرچشمہ بھی تو ذات الہیہ ہی کی قدرت اور خلاقیت ہے، گو ہم نہیں جانتے تو یہ کہ امر الہی کی کار

فرمائی نے ان وحدتوں کی شکل کیوں اختیار کی جن کو ہم خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعینہ لفظ ربی میں بھی ضمیر متکلم کے استعمال سے خودی کی ماہیت اور کردار کی کچھ اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود ان تغیرات کے جو باعتبار ایک وحدت خودی کی حد و وسع، توازن اور اثر آفرینی میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص اور منفرد وجود ہے۔“
(تشکیل جدید، ص ۱۵۵)

حوالہ آیت، سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۴
 قُلْ كُلٌّ يَّعْبُدُ عَلٰى شَاكِلَتِهِ ۖ فَرَّبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ
 اَهْدٰى سَبِيْلًا (۸۴) ۴
 ترجمہ: کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے، سو تمہارا پروردگار اس شخص سے خوب واقف ہے جو سب سے زیادہ سیدھے رستے پر ہے۔ (۸۴-۱۷) یعنی ہر ایک کافر و مومن اور معرض و مقبل اپنے اپنے طریقے، نیت، طبیعت اور مذہب پر چلتا ہے اور اسی میں لگن رہتا ہے، لیکن یاد رہے خدا کا علم سے کسی شخص کا کوئی عمل باہر نہیں ہو سکتا، وہ ہر ایک کے طریق عمل اور حرکات و سکنات کو برابر دیکھ رہا ہے اور بہ خوبی جانتا ہے کہ کون کتنا سیدھا چلتا ہے اور کس قدر کج روی اور کج راہی ہے ہر ایک کے ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کرے گا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۳۸۶)

زمان و مکاں کی دنیا میں خودی کا صدور

”دوسرا، ہم سوال جو اس بحث میں ہمارے سامنے آتا ہے یہ کہ زمان و مکاں کی اس دنیا میں خودی کا صدور کیوں کر ہوا؟ اس بحث میں بھی قرآن مجید کے ارشادات بالکل صاف اور واضح ہیں“ (تشکیل جدید، ص ۱۵۶)

حوالہ آیت۔ سورہ المؤمنون، آیات ۱۲-۱۳

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۱۲) ۴ ثُمَّ

حوالہ آیت سورہ الحدید۔ آیہ ۳۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ (۳)

ترجمہ: وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے
سب پر) ظاہر اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا
ہے۔ (۳-۵۷)

تفسیر: اور ہر ایک چیز پر غالب ہے اور ہر ایک ظاہر و باطن سے واقف اور باخبر ہے
اور اس کے علم میں کسی کے مطلع کرنے کی حاجت نہیں یا مطلب ہے کہ وہ ہر ایک چیز سے پہلے
ہے اور اس کی اولیت کی کوئی انتہا نہیں اور ہر ایک چیز کے بعد بھی ہے اور اس کے بعد رہنے کی کو
ئی انتہا نہیں یا یہ کہ وہ اول ہے کہ ہر ایک پہلی چیز کو اولیت عطا کرنے والا ہے اور آخر ہے یعنی
ہر ایک بعد والی چیز کو آخریت عطا کرنے والا، وہ سب سے اول ہے اس سے پہلے کوئی نہیں اور
وہ آخر ہے کہ سب فنا کرنے کے بعد بھی وہی رہے گا۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد سوم۔ ۳۳۰)

خودی کا شعوری کردار

ہمارے شعوری کردار کی آزادی کی تائید قرآن مجید کے اس نظریے سے ہو جاتی ہے
جو اس نے خودی کے اعمال و افعال کے بارے میں قائم کی، چنانچہ آیات ذیل میں اس
حقیقت کی طرف قطعی اشارہ موجود ہے۔ (تشکیل جدید۔ ص ۱۶۴) حوالہ آیت سورہ کہف۔

آیت ۲۹۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ
فَلْيُكْفُرْ ۗ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۖ أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۗ
وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ ۗ ط
بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (۲۹)

ترجمہ: اور کہہ دو کہ (لوگو) یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق

ہے۔ تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے، ہم نے ظالموں کے لیے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناطیں ان کو گھیر رہی ہوں گی۔ اور اگر فریاد کریں گے تو ملے گا پانی جیسے پیپ، بھون ڈالے منہ کو، کیا بُرا پینا اور کیا بُرا آرام۔ (۲۹:۱۸)

تفسیر: یعنی خدا کی طرف سے سچی باتیں سنا دی گئی ہیں، کسی کے ماننے نہ ماننے کی اسے کچھ پروا نہیں۔ جو کچھ نفع نقصان ہو گا صرف تمہارا ہو گا، ماننے نہ ماننے والے دونوں اپنا اپنا انجام سوچ لیں جو آگے بیان کیا جاتا ہے۔ دنیا کی چہل پہل محض ہیچ اور فانی ہے۔ اس کا لطف جب ہی ہے کہ فلاح آخرت کا ذریعہ بنے، وہاں محض تمہول کام نہ دے گا، بل کہ جو یہاں شکستہ حال تھے وہاں عیش و آرام میں ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی، ۳۹۶)

حوالہ آیت: سورہ بنی اسرائیل۔ آیت۔ ۷۔

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ط
فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيُسُوءَ أَوْجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا
الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ لِيَتَّبِعُوا مَا عَلَّمُوا
تَتَّبِعُوا (۷)

ترجمہ: اگر تم نیکو کاری کرو گے تو اپنی جانوں کے لیے کرو گے اور اگر اعمال بد کرو گے تو (ان کا) وبال بھی تمہاری ہی جانوں پر ہو گا۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو (ہم نے اپنے بندے بھیجے) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑ دیں اور جس طرح پہلی دفعہ مسجد (بیت المقدس) میں داخل ہو گئے تھے اس طرح پھر داخل ہو جائیں گے اور جس چیز پر غلبہ پائیں گے اسے تباہ کر دیں گے۔ (۷-۱۷)

قرآن مجید اور تقدیر انسانی کا نظریہ

”قرآن مجید نے تقدیر انسانی کا جو نظریہ قائم کیا ہے کچھ تو اخلاقی ہے اور کچھ حیاتی، حیاتی اس لیے کہ قرآن پاک نے اس ضمن میں بعض ایسے اشارات

کیے ہیں جن سے ہماری توجہ مظاہر حیات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور جن کا فہم تب ہی ممکن ہے کہ ہم اس کی کنہ اور ماہیت کے بارے میں دقت نظر اور بصیرت سے کام لیں مثال کے طور پر اس نے برزخ کا ذکر کیا ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۷۵)

انگریزی متن میں اس موقع پر سورہ المؤمنون کی آیات ۹۹، ۱۰۰ کا حوالہ دیا ہے جن

میں برزخ کا ذکر ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدُهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ (۹۹)
لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ
قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۱۰۰)

ترجمہ: (یہ لوگ اسی غفلت میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آجائے گی تو کہے گا کہ اے پروردگار، مجھے پھر (دنیا میں) واپس بھیج دے۔ تاکہ میں اس میں سے جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کیا کروں۔ ہرگز نہیں یہ ایک (ایسی) بات ہے کہ وہ اسے زبان سے کہہ رہا ہوگا (اور اس کے ساتھ عمل نہیں ہوگا) اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہیں گے) (۹۹:۲۳-۱۰۰)

درج بالا عبارت کے تسلسل میں علامہ مزید لکھتے ہیں :

”جسے گویا موت اور بعثت بعد الموت کے درمیان توقف و انتظار کی ایک حالت سے تعبیر کرنا چاہیے، بعینہ بعث بعد الموت کا تصور بھی سرتاسر مختلف ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے اس کی بنا پر مسیحیت کی طرح مخصوص انسان کی بعثت ثانیہ پر نہیں رکھی۔ وہ حیات کا ایک عالم گیر مظہر ہے جس کا اطلاق ایک حد تک وحوش و طیور پر بھی کیا جاسکتا ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۷۵۔

(۱۷۶)

حوالہ آیت۔ سورہ الانعام آیت ۳۸ :

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَيْرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۗ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ (۳۸)

ترجمہ: اور زمین میں چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں پر اڑنے والا جانور ہے۔ ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ (۶-۳۸)

تفسیر: ان آیتوں میں بعض حکمتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جو فرمائی نشانات نہ دکھلائے جانے پر مرعی ہیں، یعنی تمام حیوانات خواہ زمین پر ریگنے والے ہوں یا ہوا میں اڑتے ہوں وہ بھی انسانوں کی طرح ایک امت ہیں ان میں سے ہر نوع کو حق تعالیٰ نے خاص وضع اور فطرت پر پیدا کیا ہے جو ان کے معین خواص و افعال کے دائرہ میں کام کرتی ہے۔ کوئی جانور اپنے افعال و حرکات کے محدود حلقہ سے جو قدرت نے باعتبار اس کی فطرت اور استعداد کے مشخص کر دیے ہیں ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا۔۔ (تفسیر عثمانی۔ ص ۱۷۵)

خودی کا ظہور زمانے سے متقدم نہیں

اس سے بیش تر کہ فرد کے بارے میں بقائے دوام کے متعلق قرآن پاک کے نظریے سے بہ تفصیل بحث کی جائے، تین باتیں ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور جو از روئے قرآن مجید بالکل واضح ہیں، لہذا ہمیں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہ خودی کا ظہور اگرچہ زمانے سے وابستہ ہے لیکن اس کا وجود زمانے سے متقدم نہیں۔ ہم نے جس آیت کا ابھی حوالہ دیا تھا اس سے بھی یہ حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔

یہاں انگریزی متن میں آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ آیات اس موضوع سے متعلق نہیں نظر آتیں :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ (۱۲) ۚ ثُمَّ

جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ (۱۳) ص ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ
عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا
فَكَسَوْنَا الْعِظَ لَحْمًا ق ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ط فَتَبَرَكْ
اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۱۴) ط

ترجمہ: پھر اس کو ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر نطفے کو
لوٹھرا بنایا۔ پھر لوٹھرا کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر
گوشت (پوست) چڑھایا پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا، تو خدا جو سب سے
بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے۔ (۱۳-۱۴:۲۳)

۲۔ یہ کہ قرآن پاک کی رو سے ناممکن ہے انسان پھر اس کرہ ارضی پر واپس

آئے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۷۶) حوالہ آیت سورہ المؤمنون آیت ۹۹-۱۰۰)

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدُهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ (۹۹)
لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا ط إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ
قَائِلُهَا ط وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ بِذُرْحٍ إِلَىٰ يَوْمٍ يُبْعَثُونَ (۱۰۰)

ترجمہ: (یہ لوگ اس غفلت میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے
کسی کے پاس موت آجائے گی تو کہے گا پروردگار۔ مجھے پھر (دنیا میں)
واپس بھیج دے، تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کروں، ہرگز
نہیں یہ ایک ایسی بات ہے کہ وہ اسے زبان سے کہ رہا ہوگا (اور اس کے
ساتھ عمل نہیں ہوگا) اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ
(دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہیں گے)۔ (۹۹:۲۳-۱۰۰)

یعنی آپ ان کفار کی برائیوں کو بھلے طریقے سے دفع کرتے رہے اور جو باتیں یہ

بناتے ہیں ان کو ہمارے حوالہ کیجیے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی موت کا وقت آ پہنچے اور
نزع کی حالت میں مبادا عذاب کا معینہ کر کے پچھتاوا شروع ہو۔ اس وقت تمنا کریں گے کہ
اے پروردگار۔ قبر کی طرف لے جانے کے بجائے ہم کو پھر دنیا کی طرف واپس کر دو، تاکہ

گزشتہ زندگی میں جو تفصیلات ہم نے کی ہیں اب نیک عمل سے ان کی تلافی کر سکیں، آئندہ ہم ایسی خطائیں ہرگز نہ کریں گے۔۔۔۔

اجل آجانے کے بعد اس کام کے لیے ہرگز واپس نہیں کیا جاسکتا اور بالفرض واپس کر دیا جائے تو ہرگز نیک کام نہ کرے گا، وہی شرارتیں پھر سوچیں گی۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۶۴)
دوسری آیت۔ حوالہ۔ سورہ انشقاق۔ آیت ۱۸-۱۹:

وَالْقَبْرِ إِذَا تَسَقَّ (۱۸) لَتَرَ كَبْنًا طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۱۹) ط
ترجمہ: اور چاند کی (قسم) جب کامل ہو جائے کہ تم درجہ بہ درجہ (مرتبہ اعلا پر) چڑھو گے۔ (۱۹-۱۸-۸۴)

تفسیر: یعنی تمہیں ایک حالت میں نہیں رہنا ہے بل کہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدانِ حشر، پھر حساب کتاب، پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سرخی کی، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اس میں ان بہت سے انسانوں اور حیوانوں کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین میں پھیلے رہتے ہیں اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدرِ کامل بننا۔ یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر ٹھہراؤ نہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۲۹۱)

تیسری آیت حوالہ۔ سورہ واقعہ۔ آیات ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ (۵۸) ط ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَ أَمْ نَحْنُ
الْخَالِقُونَ (۵۹) نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ
بِئَسْبُوقِينَ (۶۰) عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا
لَا تَعْلَمُونَ (۶۱)

ترجمہ: دیکھو تو جس (نطفے) کو تم (عورتوں کی رحم میں) ڈالتے ہو کیا تم اس (سے انسان) کو بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں، ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا اور ہم

ترجمہ: تمام شخص جو زمین و آسمان میں ہیں سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے ہم (سب) کو (اپنے علم سے) گھیر رکھا ہے اور (ایک ایک کو) شمار کر رکھا ہے اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔ (۱۹-۹۳، ۹۴، ۹۵)

تفسیر: یعنی سب خدا کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں اور بندے ہی بن کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ پھر بندہ بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور جس کے سب محکوم اور محتاج ہوں اسے بیٹا بنانے کی ضرورت کیا ہے..... ایک فرد بشر بھی اس کی بندگی سے باہر نہیں ہو سکتا۔ سب کو خدا کے سامنے جریدہ حاضر ہونا ہے اس وقت تمام تعلقات اور ساز و سامان علاحدہ کر لیے جائیں گے، فرضی معبود، بیٹے اور پوتے کام نہ دیں گے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۱۶)

انگریزی متن میں ان آیات کے ساتھ مزید دو آیات کا حوالہ ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمَا خَوْلَانِكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۗ وَمَا نَرَى مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمْ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۗ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۹۴)

ترجمہ: اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے اور (جو مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا کیا فرمایا تھا وہ سب اپنے پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے (شفیع اور ہمارے) شریک ہیں (آج) تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے اور جو دعویٰ تم کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔ (۹۴:۶)

وَنَرِيهِ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا (۸۰)

ترجمہ: دو اور جو چیزیں یہ بتاتا ہے ان کے ہم وارث ہوں گے اور یہ اکیلا ہمارے سامنے آئے گا۔ (۸۰:۱۹)

متناہی خودی لا متناہی خودی کے سامنے حاضر ہوگی

”پھر نجات کے بارے میں بھی اسلام کا جو عقیدہ ہے اس کے پیش نظر یہ آخری تصریح زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ لہذا اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ متناہی خودی لا متناہی کے سامنے حاضر ہوگی۔“ (تشکیل جدید، ص

(۱۷۷)

حوالہ آیت سورہ انعام۔ آیت ۹۴:

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى ط يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ
مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ط ذَلِكَمُ اللَّهُ فَانِّي
تَوْفُكُونَ (۹۵)

ترجمہ: اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے اکیلے
ہمارے پاس آئے۔ (۶-۹۵)

(اصل خطبات میں یہ حوالہ نہیں ہے یعنی حاشیے میں اس آیت کا حوالہ نہیں دیا گیا بلکہ یہ ترجمہ (تشکیل جدید میں حاشیے میں دیا گیا ہے) تو صرف اپنی انفرادیت کو ساتھ لیے، کیوں کہ یوں ہی اپنی آنکھوں سے اپنے گزشتہ اعمال و افعال کو دیکھ کر وہ اس امر کا اندازہ کر سکتی ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ (تشکیل جدید۔ ص ۱۷۷)

حوالہ آیت سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۳-۱۴:

وَ كُلِّ انْسَانٍ الزَّمَنُ طَيْرَةٌ فِي عُنُقِهِ ط وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا (۱۳) اِقْرَأْ كِتَابَكَ ط كَفَى
بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۴) ط

ترجمہ: اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب نکال کر دکھائیں گے، جسے کھلا ہوا دیکھے گا (کہا جائے گا) اپنی کتاب پڑھ لے۔ تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ (۱۷-۱۳، ۱۴)

تفسیر: اور ہم نے ہر ایک انسان کا عمل یعنی قبر میں منکر و نکیر کو سوال و جواب کا دفتر اس کی گردن کا ہار کر رکھا ہے یا یہ کہ اس کی نیکی و بدی کا نفع و نقصان اور شقاوت و سعادت اس کے ساتھ لازم ہے اور پھر قیامت کے دن ہم اس کا نامہ اعمال اس کے دیکھنے کے لیے سامنے کر دیں گے جس سے اس کی نیکیاں اور برائیاں سب واضح ہوں گی اور وہ ان کو دیکھ لے گا، اور اس سے کہا جائے گا کہ اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے، آج تو خود اپنے اعمال کا محاسب کافی ہے۔
(تفسیر ابن عباس، جلد دوم، ص ۱۸۰)

تفسیر: یعنی نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا کہ خود پڑھ کر فیصلہ کر لے جو کام عمر بھر کیے تھے کوئی رہا تو نہیں یا زیادہ تو نہیں لکھا گیا، ہر آدمی اس وقت یقین کر لے گا کہ ذرہ ذرہ عمل بلا کم و کاست اس میں موجود ہے۔ دنیا میں جو کتاب بھیجی (قرآن کریم) اور چاند سورج وغیرہ سے جو حساب متعلق ہے پہلے اس کا ذکر تھا۔ ان آیتوں میں قیامت کے حساب کتاب کا ذکر فرمایا جو اسی حساب و کتاب پر بطور نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۳۷۶)
اجر غیر ممنون کا مطلب، تربیت یافتہ خودی متاثر نہ ہوگی :

”پھر انسان کا انجام کچھ بھی ہو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی انفرادیت کھو دے گا۔ قرآن مجید کے نزدیک انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت یہ نہیں کہ اپنی متناہیت سے محروم ہو جائے۔ اس کے اجر غیر ممنون کا مطلب ہے اس کے ضبط نفس، اس کی یکتائی اور بحیثیت ایک خودیاس کی فعالیت کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرتے جانا۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۷۷)

حوالہ آیت، سورہ والتین۔ آیت ۶:

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ

مَمْنُونٍ (۶) ط

ترجمہ: مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا

اجر ہے (۶:۹۵)

یہاں مزید آیات کا حوالہ دیا گیا ہے :

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُونٍ (۸)

۱۔ جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے ان کے لیے (ایسا) ثواب ہے جو ختم ہی نہ ہو۔ (۸:۴۱)

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَبُلَاقِيهِ (۶)
۲۔ اے انسان تو فی الحقیقت سخت کوشش کر رہا ہے کہ اپنے پروردگار سے
سستی و عمل کے زور پر ملاقات کرے تو اس ملاقات کرنے والا ضرور بن جائے
گا۔ (۶:۸۴)

حتیٰ کہ عالم گیر تباہی کا وہ منظر بھی (یہاں حاشیے میں آیت ۱۴، ۲۸ کا حوالہ ہے) جس سے قیامت کی ابتدا ہوگی۔ اس قسم کی تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ (تشکیل جدید، ص ۱۷۸) یہاں تشکیل جدید میں سورہ زمر کی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے تاہم اس سے قبل انگریزی متن میں دیے گئے حوالہ کے مطابق آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةٌ وَاحِدَةٌ (۱۳) وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ
وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (۱۴) فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ
الْوَاقِعَةُ (۱۵) وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ (۱۶)
وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ
كُنُوزٌ (۱۷) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ
خَافِيَةٌ (۱۸)

ترجمہ: توجہ سے صور میں ایک (بار) پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھالیے جائیں گے پھر ایک بارگی توڑ پھوڑ برابر کر دیے جائیں گے تو اس روز ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن کمزور ہوگا اور فرشتے اس کے کناروں پر (اتر آئیں

گے) اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اپنے سروں پر اٹھائے ہوں گے اس روز تم (سب لوگوں کے سامنے) پیش کیے جاؤ گے اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔ (۱۸، ۱۳: ۶۹)

فَإِذَا النُّجُومُ طُبِسَتْ (۸) وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ (۹) وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۱۰) وَإِذَا الرُّسُلُ اقْتَتَتْ (۱۱)

۲۔ جب تاروں کی چمک جاتی رہے، اور جب آسمان پھٹ جائے، اور جب پہاڑ اڑے اڑے پھریں اور جب پیغمبر فراہم کیے جائیں۔

(۱۱، ۸: ۷۷)

اصل انگریزی متن میں صرف سورہ زمر کی آیت کا حوالہ ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَبَقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ
إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ
يَنْظُرُونَ (۶۸)

ترجمہ: اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جسے خدا چاہے پھر جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ (۶۸-۳۹)

تفسیر: اور صور میں پھونک ماری جائے گی تو آسمان وزمین والے مر جائیں گے مگر جنت و دوزخ والے اور کہا گیا ہے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت وہ پہلی صور پھونکے جانے پر نہیں مریں گے بل کہ اس کے بعد مریں گے اور پھر مڑوں کو زندہ کرنے کے لیے دوبارہ صور میں پھونک ماری جائے گی اور ان دونوں صوروں میں چالیس سال کا وقفہ ہوگا اور پھر آسمان سے باریک بارش کی بوندیں گریں گی۔ پھر اس صور کے بعد چانک لوگ قبروں سے کھڑے ہو جائیں گے اور چاروں طرف دیکھیں گے کہ ان سے کیا کہا جا رہا ہے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۱۵۶)

تفسیر: الامن شاء الله سے بعض نے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت

مراد لیے ہیں، بعض نے ان کے ساتھ حملۃ العرش کو بھی شامل کیا ہے، بعض کے نزدیک انبیاء و شہدا مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہر حال یہ استثنا، اس نوحہ کے وقت ہوگا اس کے بعد ممکن ان پر بھی فنا طاری کر دی جائے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۶۲۰)

انگریزی متن کے حاشیے میں ایم سعید شیخ نے مزید آیات کا حوالہ دیا ہے۔
 وَمَنْ يَّعْتَلِ مِنَ الصُّلْحِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَ
 لَا هَضْبًا (۱۱۲)

ترجمہ: اور جو نیک کام کرے گا اور مومن ہوگا اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔ (۱۱۲:۲۰)

لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّهُمُ الْمَلَائِكَةُ ط هَذَا
 يَوْمَكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۱۰۳)

۲۔ ان کو (اس دن کا) بڑا بھاری خوف غمگین نہیں کرے گا اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے (اور کہیں گے کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ (۱۰۳:۲۱)

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ (۶) فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ (۷)
 ۳۔ تو جس کے (اعمال کے) وزن بھاری نکلیں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ (۷:۱۰۱، ۷)

لیکن ظاہر ہے اس قسم کے استثنا کا اطلاق ان ہی شخصیتوں پر ہو سکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو، لہذا اس کی نشوونما کا معراج کمال یہ ہے کہ ہم اس خودی سے براہ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے اپنے آپ کو قائم اور برقرار رکھیں جیسا کہ قرآن پاک نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاہدہ ذات کے بارے میں فرمایا۔ (تشکیل جدید، ص ۱۷۸)

یہاں سورہ والنجم کی آیت ۷ کا حوالہ دیا گیا ہے:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (۱۷)

ترجمہ: ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) بڑھی۔

(۱۷:۵۳)

تفسیر: یعنی آنکھ نے جو کچھ دیکھا پورے تمکن و اتقان سے دیکھا، نہ نگاہ ٹیڑھی ترچھی ہو کر داہنے بائیں ہٹی نہ مبصر سے تجاوز کر کے آگے بڑھی، بس اسی چیز پر جمی رہی جس کا دکھلانا منظور تھا، بادشاہوں کے دربار میں جو چیز دکھائی جائے اس کو نہ دیکھنا اور جو نہ دکھلای جائے اس کو تا کننا دونوں عیب ہیں آپ ان دونوں سے پاک تھے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۶۹۹)

انسان کائنات کے مقصود و مدعا میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو سکتا ہے۔

تینوں حقائق ذہن نشین ہو جائیں تو اسلام کا نقطہ نظر باسانی سمجھ میں آجاتا ہے، قرآن پاک کی رو سے یہ عین ممکن ہے کہ ہم کائنات کے مقصود و مدعا میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں۔ (تشکیل جدید، ص ۱۷۹)

حوالہ سورہ القیامہ۔ آیات ۳۶-۴۰:

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (۳۶) ط أَلَمْ يَكُ نَظْفَةً
مِّنْ مَّنِيٍّ يُنْسَى (۳۷) ط ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى
(۳۸) ط فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (۳۹) ط
الْيَسَّ ذَلِكَ بِقَدْرِ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى (۴۰) ط

ترجمہ: کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ منی کا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا، پھر لو تھڑا ہوا (خدا نے) اس کو بنایا پھر (اس کے اعضا کو) درست کیا، پھر اس کی دو قسمیں بنائیں (ایک) مرد اور (ایک) عورت۔ کیا اس کو قدرت نہیں کہ مردوں کو جلد

اٹھائے۔ (۴۰-۳۶:۷۵)

تفسیر: یعنی کی آدمی یہ سمجھا ہے کہ اس کو یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور امر وہی کی کوئی قید نہ ہوگی، یا مرے پیچھے اٹھایا نہ جائے گا اور سب نیک و بد حساب نہ لیں گے۔۔۔

یعنی نطفہ سے جسے ہوئے خون کی شکل میں آیا، پھر اللہ نے اس کی پیدائش کے مراتب پورے کر

کے انسان بنا دیا اور تمام ظاہری اعضا اور باطنی قوتیں ٹھیک کر دیں، ایک نطفہ بے جان سے انسان عاقل بن گیا، پھر اسی نطفہ سے عورت اور مرد دو قسم کے آدمی پیدا کیے، جن میں سے ہر ایک کی ظاہری اور باطنی خصوصیات جدا گانہ ہیں، کیا وہ قادر مطلق جس نے اولاً سب کو ایسی حکمت و قدرت سے بنایا اس پر قادر نہیں کہ دوبارہ زندہ کر دے۔ (تفسیر عثمانی۔ ص ۷۶۸)

یہ ارتقا یافتہ ہستی یونہی فنا نہیں ہوگی

”جس ہستی کے ارتقا میں لاکھوں کروڑوں برس صرف ہوئے اس کے متعلق کہنا کچھ غیر اغلب سا نظر آتا ہے کہ وہ ایک عبث اور لا حاصل سی شے کی طرح ضائع ہو جائے گی، لیکن کائنات کے مقصود و مدعا میں شریک ہوگی تو ایک روز افزوں خودی کی حیثیت سے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۷۹)

حوالہ آیات۔ سورہ الشمس آیات ۷ تا ۱۰:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا (۷) ص ۱۰ فَالْهَبْهَا فَجَوْرَهَا
وَتَقْوَاهَا (۸) ص ۱۱ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۹) ص ۱۲ وَقَدْ خَابَ
مَنْ دَسَّاهَا (۱۰) ط

ترجمہ: اور انسان کی قسم ہے اور اس کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا۔
پھر اس کو بدکاری سے (بچنے کے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی، کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔ (۹۱-۷ تا ۱۰)۔

تفسیر: اول تو اجمالی طور پر عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے ذریعے بھلائی برائی میں فرق کرنے کی سمجھ دی، پھر تفصیلی طور پر انبیاء و رسل کی زبانی کھول کھول کر بتلا دیا کہ یہ راستہ بدی کا اور یہ راستہ پرہیزگاری کا ہے، اس کے بعد قلب میں جو نیکی کا رجحان یا بدی کی طرف میلان ہو، ان دونوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے گو القاء اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے اور ثانی میں شیطان۔
خاک میں ملا چھوڑنے سے مراد یہ ہے کہ نفس کی باگ ڈور یکسر شہوت و غضب کے

ہاتھ میں دے دے، عقل و شرح سے کچھ سروکار نہ رکھے، گویا خواہش اور۔۔ کا بندہ بن جائے
ایسا آدمی جانور سے بدتر اور ذلیل ہے۔ (تفسیر عثمانی۔ ص ۷۹۳)

روح میں افزونی عمل سے پیدا ہوگی

”مگر پھر روح میں افزونی پیدا ہوگی تو کس طرح اور کیسے ہوگا کہ وہ فساد اور
ہلاکت سے محفوظ رہے اس کا جواب ہے عمل سے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۸۰)

حوالہ آیات۔ سورہ الملک۔ آیات۔ ۲۱:

تَبْرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
(۱) الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ
عَمَلًا ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۲)

ترجمہ: وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے
اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری
آزمائش کر سکے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست (اور)
بخشنے والا ہے۔ (۲۱-۶۷)

تفسیر: یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا
کہ ان کا امتحان لے اور دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے، اس مختصر سے فقرے میں بہت
سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے۔
کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا، دوسرے یہ کہ انسان جیسی مخلوق جسے نیکی
اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت، خالق نے اسے
یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے، زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی
یہ ہیں کہ امتحان کا وقت ختم ہو گیا ہے، تیسرے یہ کہ اس امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو
ایک عمل کا موقع دیا ہے تاکہ دنیا میں کام کر کے اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے
کہ وہ انسان کیسا ہے، چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل

اچھا ہے یا بُرا، اعمال کی اچھائی یا برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں بل کہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ممتحن کے نزدیک حُسنِ عمل کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۴۲)

”گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے لاناہتا مواقع میسر آتے ہیں اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تاکہ وہ دیکھ سکے اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے نہ درد۔ اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا اس کی ہلاکت و تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ لہذا یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے عمل پر موقوف ہے اور اس لیے خودی کو برقرار رکھیں گے تو وہی اعمال جن کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہم بلا امتیاز من و تو خودی کا احترام کریں۔ لہذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں اس کے حصول کا دار و مدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ بالفاظ دیگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۰)

حیاتِ ثانیہ کا قیاسِ خلقِ اول کی مماثلت پر

”دراصل بعث بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں۔ یہ خودی ہی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے اور جسے انفرادی یا اجتماعی جس لحاظ سے دیکھیے، دونوں صورتوں میں محاسبہ ذات کی وہ ساعت ہے جس میں خودی اپنے گزشتہ اعمال کا جائزہ لیتی اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے، قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے کہ ہم اپنی حیاتِ ثانیہ کا قیاسِ خلقِ اول کی مماثلت پر کریں۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۲)

حوالہ آیت، سورہ مریم آیت ۶۶، ۶۷:

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَاتَ لَسَوْفَ أُنْحَرَجُ حَيًّا (۶۶) أَوَلَا يَذْكُرُ
الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (۶۷)

ترجمہ: اور (کافر) انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ کیا۔۔۔ انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے پیدا کیا تھا اور وہ کچھ بھی چیز نہ تھا۔ (۱۹-۶۶، ۶۷)

تفسیر: یعنی آدمی ہو کر اتنی موٹی بات نہیں سمجھتا کہ چند روز پہلے وہ کوئی چیز نہ تھا، حق تعالیٰ نے نابود سے بود کیا، کیا وہ ذات جو لاشے کو شے اور معدوم محض کو موجود کر دے اس پر قادر نہیں کہ ایک چیز کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر سکے۔ آدمی کو اپنی پہلی ہستی کی کیفیت یاد نہیں رہی جو دوسری ہستی کا مذاق اڑاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۴۱۴)

حوالہ آیت ۲- سورہ

نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (۶۰)
عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئْكُمْ فِي مِمَّا لَا تَعْلَمُونَ (۶۱)
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (۶۲)

ترجمہ: ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا، اور ہم اس بات سے عاجز نہیں کہ تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی پھر تم سوچتے کیوں نہیں۔ (۵۶-۶۰-۶۲)

یعنی یہ تو تم جانتے ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کے صلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے، کس طرح رحمِ مادر میں جو قبر سے کم تاریک نہ تھا تمہیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا، کس طرح ایک ذرہ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ، کان اور ناک اور ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تدبیر و تسخیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ (تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص ۲۸۷)

حیات بعد الموت اور خودی کی کیفیت

بہر حال فلاسفہ اسلام اور علمائے الہیات کے درمیان جو مسئلہ مختلف فیہ ہے وہ یہ ہے

کہ انسان کی بعثت ثانیہ پر کیا اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا، اس میں زیادہ تر خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ کی رائے بھی جن پر گویا الہیاتِ اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں ان کے اس نظریے کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ جب ہم خودی کا تصور بحیثیت ایک فرد کے کرتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے کسی مقام یا اختیاری پس منظر میں نسبت دیں۔ آیت ذیل سے البتہ اس مسئلے کی کچھ اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ (تشکیلِ جدید، ص ۱۸۴)

حوالہ آیات سورہ ق۔ آیات ۴، ۳ :

إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۖ ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ (۳) قَدْ عَلِمْنَا مَا
تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ۗ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ (۴)

ترجمہ: بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے، ان کے جسموں کو زمین جتنا (کھا کھا کر) کم کرتی جاتی ہے ہم کو معلوم ہے اور تمہارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔ (۵۰)۔
(۴، ۳)

..... یعنی یہ بات ان لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ ان کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے جسم کے اجزا جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئیندہ بکھرتے چلے جائیں گے، ان کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں ہر جز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہ راست اس کو جانتا ہے اور مزید براں اس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے، جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص ۱۱۰)

”میرے نزدیک اس آیت سے صاف مترشح ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی حیاتِ عملی کی جب ہی تکمیل کر سکتا ہے جب اسے ایک ایسی انفرادیت حاصل کر لے (ہو) جو اس ماحول میں اپنے انتزاع و انتشار کے باوجود اپنے آپ

کو قائم اور برقرار رکھ سکے، البتہ ہمیں نہیں معلوم تو یہ کہ یہ سب کچھ ہوگا کیسے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۱۸۴)

”اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ انسان کا معاد کسی نہ کسی جسد عنصری سے وابستہ ہے، خواہ اس جسد عنصری کی حقیقت کچھ بھی ہو اور سردست ہم اسے سمجھ بھی نہ سکیں، جب بھی بعثت ثانیہ کے باب میں ہمیں کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے بھی اس سلسلے میں جن مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ بعثت ثانیہ ایک حقیقت یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لہذا جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ماضی پر غور کیجیے تو یہ امر اغلب نظر آتا ہے کہ اس کی ہستی کا سلسلہ جسم کی ہلاکت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ قرآن مجید کی تعلیمات اس باب میں بہر حال یہ ہیں کہ بعثت بعد الموت پر انسان کی بصارت تیز ہو جائے گی۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۵)

حوالہ آیت سورہ ق آیت ۲۲:

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ
فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۲۲)

ترجمہ: (یہ وہ دن ہے کہ) جس سے تو غافل ہو رہا تھا، اب ہم نے تجھ پر سے

پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ (۲۲-۵۰)

تفسیر: یعنی اب تو تجھے خوب نظر آ رہا ہے کہ وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جس کی خبر

خدا کے نبی دیتے تھے۔ (تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص ۱۱۸)

تفسیر: یعنی اس وقت کہا جائے گا کہ دنیا کے مزوں میں پڑ کر تو آج کے دن سے

بے خبر ٹھا اور تیری آنکھوں کے سامنے شہوات و خواہشات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، پیغمبر جو سمجھاتے

تھے، کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، آج ہم نے تیری آنکھوں کے پردے ہٹا دیئے اور نگاہ خوب تیز کر دی

۔ اب دیکھ لے جو باتیں کہی گئی تھیں صحیح ہیں یا غلط۔ (تفسیر عثمانی، ص ۶۸۹)

تفسیر: یہ فقرہ اس تفسیح کے لیے طنز کے انداز میں ہوگا کہ آج تو تمہاری نگاہیں بہت تیز ہیں جس چیز کا امکان تمہیں کہیں دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا، آج اس کا ہر گوشہ کس طرح تمہارے آگے بے نقاب ہو گیا ہے۔ (مذہب قرآن، جلد ہفتم، ص ۵۴۹)

انسان کی قسمت کا حال اس کے گردن میں

”وہ اپنی گردن میں خود اپنی تیار کردہ قسمت کا حال آویزاں پائے گا۔“ (تشکیل

جدید۔ ص ۱۸۵)

حوالہ آیت سورہ بنی اسرائیل۔ آیت نمبر ۱۳:

وَ كُلُّ إِنْسَانٍ لِّزَمَانِهِ طَيْرَةٌ فِى عُنُقِهِ ۖ وَ نَخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا (۱۳)

ترجمہ: اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال کر دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ (۱۷-۱۳)

تفسیر: اور ہم نے ہر ایک انسان کا عمل یعنی قبر میں منکر و نکیر کو سوال و جواب کا دفتر اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے، یا یہ کہ اس کی نیکی و بدی اس کا نفع و نقصان اور شقاوت و سعادت اس کے ساتھ لازم ہے اور پھر قیامت کے دن ہم اس کا نامہ اعمال اس کے دیکھنے کے لیے سامنے کر دیں گے جس میں اس کی نیکیاں اور برائیاں سب واضح ہوں گی اور وہ ان کو دیکھ لے گا اور اس سے کہا جائے گا اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے، آج تو خود اپنے اعمال کا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ (تفسیر ابن عباس۔ جلد دوم ص ۱۸۰)

جنت و دوزخ احوال ہیں مقامات نہیں

جنت اور دوزخ اس کے احوال ہیں مقامات یعنی کسی جگہ کا نام نہیں ہیں چناں چہ

قرآن پاک میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ ایک داخلی حقیقت یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۸۵)

اس حوالے سے ایم سعید شیخ نے انگریزی خطبات میں متعدد آیات کا حوالہ دیا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّغْلُومٌ (۴۱) ۱ فَوَاكِهُ ءَ وَهُمْ
 مُكْرَمُونَ (۴۲) ۲ فِی جَنَّتِ النَّعِیمِ (۴۳) ۳ عَلٰی سُرِّ مُتَقَابِلِیْنَ
 (۴۴) ۴ یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۴۵) ۵ بَیضَاءَ لَذَّةٍ
 لِلشَّرِیِّیْنَ (۴۶) ۶ لَا فِیْهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا یُنزَفُونَ (۴۷)
 وَعِنْدَهُمْ قَصْرَاتُ الطَّرْفِ عِیْنٍ (۴۸) ۷ كَأَنَّهُنَّ بَیضٌ
 مَّكْنُونٌ (۴۹)

ترجمہ: یہی لوگ ہیں جن کے لیے روزی مقرر ہے (یعنی) میوے اور ان کا
 اعزاز کیا جائے گا نعمت کے باغوں میں، ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر
 (بیٹھے ہوں گے) شراب لطیف کے جام کا ان میں دور چل رہا ہوگا۔ جو رنگ
 کی سفید اور پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہوگی۔ نہ اس سے درد سر ہو
 اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں۔ ان کے پاس عورتیں ہوں گی جو نگاہیں نیچی
 رکھتی ہوں گی اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی، گویا محفوظ انڈے ہیں۔

(۴۹:۳۷-۳۹)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ (۵۱) ۱ فِی جَنَّتِ وَعُیُونَ (۵۲) ۲
 ۳ یَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ ۴ وَاسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِیْنَ (۵۳) ۵
 كَذٰلِكَ ۶ وَزَوْجَنَّهُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ (۵۴) ۷ یَدْعُونَ فِیْهَا
 بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ (۵۵) ۸

۲۔ بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ (یعنی) باغوں
 اور چشموں میں۔ حریر کا باریک اور دبیز لباس پہن کر ایک دوسرے کے
 سامنے بیٹھے ہوں گے (وہاں) اس طرح (کا حال ہوگا) اور بڑی بڑی
 آنکھوں والی سفید رنگ کی عورتوں سے ان کے جوڑے لگائیں گے۔ وہاں
 خاطر جمع سے ہر قسم کے میوے منگائیں گے (اور کھائیں گے)۔

(۵۵:۴۴، ۵۵)

اذلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ (۶۲) اِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً
 لِلظَّالِمِينَ (۶۳) اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ
 (۶۴) طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رِئُوسُ الشَّيْطٰنِ (۶۵) فَاِنَّهُمْ لَا
 يَكُوْنُوْنَ مِنْهَا فَبٰلِغُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (۶۶) ط ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ
 عَلَيَّهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَرِيْمٍ (۶۷) ه ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَآلِى
 الْجَحِيْمِ (۶۸)

۳۔ بھلا یہ مہربانی اچھی ہے یا تھوہر کا درخت، ہم نے اس کو ظالموں کے
 لیے عذاب بنا رکھا ہے وہ درخت ہے جہنم کے اسفل میں اُگے گا۔ اس کے
 خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیطان کے سر، سو وہ اسی میں کھائیں گے اور اسی
 سے پیٹ بھریں گے۔ پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا
 جائے گا۔ پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ (۶۸، ۶۷: ۳۷)

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ (۴۳) طَعَامُ الْاٰثِمِ (۴۴) ص لے
 كَالْمُهْلِ ه يَغْلِي فِي الْبُطُوْنَ (۴۵) كَغَلِي الْحَرِيْمِ
 (۴۶) خُذُوْهُ فَاَعْتَلُوْهُ اِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ (۴۷) ثُمَّ صُبُّوْا
 فَوْقَ رَاسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَرِيْمِ (۴۸) ط ذُقْ لَقِ اِنَّكَ اَنْتَ
 الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (۴۹)

۴۔ بلاشبہ توہر کا درخت، گناہ گار کا کھانا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا پلیٹوں میں
 (اس طرح) کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے (حکم دیا جائے گا کہ)
 اس کو پکڑ لو اور کھینچتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ۔ پھر اس کے سر پر کھولتا ہوا
 پانی انڈیل دو کہ عذاب پر عذاب ہو۔ (۴۹، ۴۳: ۴۲)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُوَّةٍ اَعْيُنٍ ه جَزَاءُ بِنٰ
 كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۷)

۵۔ کوئی تنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر

رکھی گئی ہے، یہ ان کے اعمال کا صلہ ہے جو کرتے تھے۔ (۱۷، ۳۲)

دوزخ کی آگ

”جیسا کہ دوزخ کے بارے میں ارشاد ہے اللہ کی جلالتی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچتی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۵)

حوالہ آیت سورہ الہمزہ آیت ۶، ۷:

نَارُ اللَّهِ الْمَوْقَدَةُ (۶) الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَيْهَا الْفِئْدَةُ (۷)

ترجمہ: وہ خدا کی کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں میں جا لیٹے گی۔

(۷، ۶-۱۰۴)

تفسیر: واللہ وہ ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جو کافروں کی لیے اللہ نے سلگا رکھی ہے، وہ آگ سب کچھ کھا کر دل تک پہنچ جائے اور وہ آگ کافروں پر اس طرح بند کر دی جائے گی کہ وہ لوگ اس کے ستونوں میں گھرے ہوں گے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۴۹۴)

انسان ابدی لعنت کا مستحق نہیں

”اسلام انسان کو ابدی لعنت کا مستحق نہیں ٹھہرایا، چنانچہ قرآن مجید نے

لفظ، خلود، کی تشریح دوسری آیات میں اس طرح کر دی ہے کہ اس سے مراد

محض ایک مدت زمانی ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۸۶)

حوالہ آیت سورہ النباء آیت ۲۳:

لَا يَبِثُّنَ فِيهَا أَحْقَابًا (۲۳) ۴

ترجمہ: اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ (۲۳-۷۸)

تفسیر: جن کا کوئی شمار نہیں، قرن ہا قرن گزرتے چلے جائیں گے اور ان کی مصیبت

کا خاتمہ نہ ہوگا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۷۷۴)

تفسیر: اصل میں لفظ احقاب استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی پے درپے آنے

والے طویل زمانے، ایسے مسلسل ادوار کہ ایک دور ختم ہوتے ہی دوسرا دور شروع ہو جائے، اس

لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن کی زندگی میں ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی۔ (علامہ نے یہی مراد لی ہے) کیوں کہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں، بہر حال جب مدتوں کا لفظ استعمال کیا گیا تو اس سے یہی متصور ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہوں گی۔ بل کہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہوں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے، ایک عربی لغت کے لحاظ سے حقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو، اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہنی کے لیے بولا جائے گا جو پے درپے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔۔۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع سے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اس موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ (تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ ص ۲۲۹)

جہنم خدا کا انتقام اور ہاویہ نہیں

”یوں بھی انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرے اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی جائے، لہذا سیرت اور کردار کی تبدیلی کے لیے وقت کی ضرورت ہوگی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جہنم بھی کوئی، ہاویہ نہیں جسے کسی منتقم خدا نے اس لیے تیار کر رکھا ہے کہ گناہ گار ہمیشہ اس میں گرفتار عذاب رہیں۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۶)

حوالہ آیات (حاشیہ میں) سورہ القارعہ آیات ۸ تا ۱۱ :

(۸) فَأَمَّهَ هَاوِيَةٌ (۹) وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَةٌ (۱۰) نَارُ
حَامِيَةٌ (۱۱)

ترجمہ: اور جس کی ہلکی ہوئیں تو لیں، تو اس کا ٹھکانہ گڑھا ہے اور تو کیا سمجھتا ہے، وہ کیا ہے آگ ہے دکھتی ہوئی۔ (۱۰۱-۱۱۳۸)

تفسیر: ہاویہ، ہوی سے ہے جس کے معنی اونچی جگہ سے نیچی کرنے کے ہیں اور ہاویہ

اس گڑھے کے بارے میں بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے، جہنم کو ہاویہ کا نام اس لیے دیا گیا کہ وہ بہت عمیق ہوگی اور اہل جہنم اس میں اوپر سے پھینکے جائیں گے۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۲۳۷)

انگریزی متن کے حاشیے میں سورہ الحدید کی آیت ۱۵ کا حوالہ دیا گیا ہے :

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ط
مَا وَالَكُمْ النَّارُ ط هِيَ مَوْلَاكُمْ ط وَبئْسَ الْمَصِيرُ (۱۵)

ترجمہ: تو آج تم سے معاوضہ نہیں لیا جائے گا اور نہ (وہ) کافروں ہی سے (قبول کیا جائے گا) تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے (کہ) وہی تمہارے لائق ہے اور وہ بڑی جگہ ہے۔ (۱۵:۵۷)

دوزخ تا دیب کا عمل

”وہ درحقیقت تا دیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمت خداوندی کی نسیم جاں افروز کا اثر قبول کر سکے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۶)

حوالہ آیت حاشیہ۔ سورہ البقرہ۔ آیت ۷۴ :

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ
قَسْوَةً ط وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ط وَإِنَّ
مِنْهَا لَمَا يَشَّقُّ فَيُخْرِجُ مِنْهُ الْمَاءُ ط وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ
مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ط وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۷۴)

ترجمہ: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ ہو گئے جیسے پتھریا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔“ (۷۴:۲)

”جنت بھی لطف و عیش یا آرام و تعطیل کی کوئی حالت نہیں زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لیے انسان بھی ذات لامتناہی کی نوبہ نوع تجلیات کے لیے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۸۶)

حوالہ آیت۔ سورہ رحمان۔ آیت ۳۹ :

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي

شأن (۲۹) ء

ترجمہ: آسمان و زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز

کام میں مصروف رہتا ہے۔ (۲۹:۵۵)

تفسیر: وہ ہر روز کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا ہے، تمام امور کسی کے قبضہ قدرت

میں ہیں جو احاطہ شمار سے باہر ہیں۔ (تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۳۱۷)



اسلامی ثقافت کی روح

The Spirit of Muslim Culture

اس مقالہ کی ابتدا میں اقبال نے شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت میں فرق کو واضح کیا ہے کہ صوفی کو جولدت خدا کے قرب یا اتصال سے حاصل ہوتی ہے وہ چھوڑ کر واپس نہیں آنا چاہتا لیکن نبی نہ صرف واپس آتا ہے بل کہ پرانے نظام کو زیر و زبر کر کے دنیا میں تہذیبی انقلاب برپا کرتا ہے نبی کے روحانی مشاہدات و واردات کو ایک تخلیقی عمل ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ایک طرف وہ اپنے تجربے کی صداقت کو خود جانچتا ہے اور دوسری جانب خارجی حقائق کی دنیا کے حوالے سے پرکھتا ہے۔ مزید یہ کہ نبی کے مذہبی مشاہدات و واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ یہ دیکھ کر بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے یا نبی کی تعلیمات کے زیر اثر انسانوں میں کس قسم کا تغیر رونما ہوا یا تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جو اس دعوت سے ظہور میں آئی۔ اس بحث میں اقبال عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وحی خاصہ حیات ہے اور جوں جوں وہ ارتقا حاصل کرتی ہے اس کی ماہیت بھی بدلتی جاتی ہے حتیٰ کہ جب معراج کمال کو پہنچتی ہے تو اس کا خاتمہ ضروری ہو جاتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ معراج کمال کو پہنچ گئی اس لیے اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور موروثی بادشاہت کو جائز نہ رکھا، بار بار عقل اور تجربہ پر زور دیا، عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس میں یہی نقطہ مضمر ہے۔

قرآن نے مشاہدہ باطن کے علاوہ علم انسانی کے لیے دوسرے چشموں کا ذکر کیا ہے ایک عالم فطرت اور دوسرا عالم تاریخ، اقبال کے خیال میں ان دوسرے چشموں سے استفادہ کرنے میں اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ جب مسلمانوں نے اس حقیقت کو پایا کہ کائنات میں حرکت ہے تو انہوں نے یونانی فلسفہ کے قیاسات و نظریات کے خلاف بغاوت کی۔ قرآنی تعلیمات کے زیر اثر ان کی توجہ ٹھوس حقائق کی طرف مبذول ہوئی۔ یہ قرآنی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ مسلمانوں نے سائنس کی بنیاد رکھی جس کے ثمرات آگے چل کر یورپ میں ظاہر ہوئے۔ اسی طرح دنیائے اسلام میں حس تاریخ کی پرورش بھی قابل مطالعہ موضوع ہے اس کی ابتدا راویان حدیث ہوئی اور رفتہ رفتہ تاریخی تنقید کے اصول مرتب ہوتے چلے گئے، ابن اسحاق، طبری اور مسعودی جید مورخ پیدا ہوئے بالآخر ابن خلدون نے تعلیمات قرآن کی روشنی میں فلسفہ تاریخ پیش کرتے ہوئے اس کی بنیاد دو اصولوں پر رکھی۔ وحدت انسانیت اور حیات انسانی کی مسلسل اور مستقل حرکت۔ (ملخص۔ ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود۔ جلد سوم۔ ص ۳۷۸۔

(۳۷۹)

عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی قدر و قیمت

”انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے، علیٰ ہذا یہ کہ تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جس کا ظہور ان کی دعوت سے ہوا۔ چنانچہ اس خطبے میں بھی ہمارے پیش نظر یہی امر ہے۔ یہ نہیں کہ عالم اسلام نے علم و حکمت میں جو خدمات سرانجام دیں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی نگاہیں ان تصورات پر رکھیں جو اسلامی ثقافت میں کارفرما ہیں یوں ہی ہم اس سلسلہ افکار کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں جس کی اس طرح ابتدا ہوئی۔ یوں ہی ہمیں اس روح کی تھوڑی بہت جھلک بھی نظر آئے گی جو ان میں کام کرتی رہی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی بحث میں آگے بڑھیں

ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی تصور - میرا مطلب ہے عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی قدر و قیمت پورے طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔ (تشکیل جدید، ص ۱۹۰)

اس حوالے سے حاشیے میں سورہ الاحزاب کی آیت ۴۰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (تشکیل

جدید میں حوالہ ۴:۳۳ ہے جو دراصل ۴۰:۳۳ ہے)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ
وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۴۰) ۴

ترجمہ: (محمدؐ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بل کہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اسے ختم کرنے والے ہیں) اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ (۴۰:۳۳)

وحی خاصہ حیات

”قرآن مجید نے لفظ وہی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصہ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی۔“

(تشکیل جدید، ص ۱۹۱)

اس حوالے سے انگریزی متن کے حاشیے میں درج ذیل آیات کا حوالہ دیا گیا ہے:

بَانَ رَبِّكَ أَوْحَىٰ لَهَا (۵)

۱۔ کیوں کہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔ (۵:۹۹)

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۗ
وَزَيْنًا سَبَّأً الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۗ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ

الْعَلِيمِ (۱۲)

۲۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا

حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے (ستاروں) سے مزین کیا اور

شیطانوں سے محفوظ رکھا یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کیے ہوئے)

اندازے ہیں۔ (۱۲:۴۱)

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنْ اتَّخِذِى مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَّ
مِنَ الشَّجَرِ وَّ مِمَّا يَعْرِشُونَ (۶۸) ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ
الشَّمْرَاتِ فَاَسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۗ يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا
شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهُ فِىهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۗ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَاٰیةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۶۹)

۳۔ اور تمہارے خدا نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پیڑوں اور درختوں
میں اور (اونچی اونچی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔ اور ہر قسم
کے میوے کھا اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا، اس کے پیٹ
سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں
(کے کئی امراض) کی شفا ہے بے شک سوچنے والوں کے لیے اس میں بھی
نشانی ہے۔ (۱۲:۶۸، ۶۹)

اِذْ يُوحِى رَبُّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبَّتُوا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا ۗ سَالَقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرَّعْبَ فَاَضْرِبُوْا
فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَّ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ط

۴۔ جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ تمہارے ساتھ ہوں تم
مومنوں کو تسلی دو کہ ثابت قدم رہیں۔ میں ابھی ابھی کافروں کے دلوں میں
رعب ڈالے دیتا ہوں تو ان کے سر مار (کر) اٹا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ
دو۔ (۱۲:۸)

وَ اَوْحٰىنَا اِلٰى اُمِّ مُوسٰى اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۗ فَاِذَا خِفتِ عَلَیْهِ
فَاَلْقِیْهِ فِى الْیَمِّ وَّ لَا تَخَافِیْ وَّ لَا تَحْزَنِیْ ۗ اِنَّا رَاٰوْهُ اِلَیْكَ وَّ
جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۷)

۵۔ اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاو، جب تم
کو اس کے بارے میں خوف پیدا ہوا تو دریا میں ڈال دینا اور نہ رنج کرنا ہم

اس کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور پھر اسے پیغمبر بنا دیں گے۔

(۷:۲۸)

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي ۗ
قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۱۱۱)

۶۔ اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔ (۱۱۱:۵)

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحِيًّا أَوْ مِنْ دَرَاءٍ
حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذَنِهِ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ عَلِيُّ
حَكِيمٌ (۵۱)

۷۔ اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے بے شک وہ عالی مرتبہ (اور) حکمت والا ہے۔

(۵۱:۴۲)

شعور نبوت

”اب بنی نوع انسان کے عالم صغرنسی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی کا نشوونما شعور کی وہ صورت اختیار کر لے جسے ہم نے شعور نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا۔ انہیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ انہیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۹۱)

اس عبارت کے حوالے سے تشکیل کے حاشیے میں دو آیات دی گئی ہیں۔

پہلے سورہ جمعہ کی آیت نمبر ۲:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا
مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۲)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا
کر (بھیجا جو اس کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے
(خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح
گمراہی میں تھے۔ (۲-۶۲)

اور دوسری آیت سورہ الحديد سے آیت نمبر ۲۵ (تشکیل جدید میں حوالہ ۵۷: ۱۲۵)

(ہے جو درست نہیں)

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ
وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ؕ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ
بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ
وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (۲۵)

ترجمہ: ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ
بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم
ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں یہ اس
لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس
کے رسولوں کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ بڑی قوت والا زبردست ہے۔

(۲۵: ۵۷)

ان دونوں آیات کا حوالہ انگریزی خطبات میں ایم سعید شیخ نے نہیں دیا بل کہ یہ

صرف تشکیل جدید کے حاشیے میں دیا گیا ہے۔

اسلام میں نبوت کی معراجِ کمال

”لہذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ معراجِ کمال کو پہنچ گئی، لہذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۹۳)

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّهْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۳)

ترجمہ: آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔ (۳:۵)

انفس و آفاق ذریعہ علم

”قرآن مجید نے انفس و آفاق دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد ہے کہ آیات الہیہ کا ظہور محسوسات و مدركات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کما حقہ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۱۹۴)

انفس و آفاق کے حوالے سے یہاں حاشیے میں سورہ خم السجدہ کی آیت نمبر ۵۳ دی گئی ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳)

ترجمہ: ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے۔ (۵۳-۴۱)

عالمِ فطرت، ذریعہ علم

”مشاہداتِ باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علمِ انسانی کا۔ قرآن پاک کے

نزدیک اس کے دوسرے چشمے اور ہیں۔ ایک عالمِ فطرت، دوسرا عالمِ تاریخ۔ جن سے استفادہ کرنے میں عالمِ اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر، یہ سایوں کا امتداد، یہ اختلاف لیل و نہار، یہ رنگ اور زبان کا فرق، اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد و شد، حاصلِ کلام یہ کہ یہ سارا عالمِ فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقتِ مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے۔“ (تشکیلِ جدید، ص، ۱۹۶) اس عبارت میں بیان کردہ نکات کے حوالے سے بھی حاشیے میں چند آیات دی گئی ہیں:-

ترجمہ بالترتیب یوں ہے :

حوالہ حاشیہ۔ سورہ حم، آیت ۳۷ :

وَمِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَا تَسْجُدُوا
لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ
إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۳۷)

ترجمہ: اور رات دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو، اور نہ چاند کو بل کہ خدا ہی کو سجدہ کرو۔ (۳۷-۳۸)

سورہ الفرقان آیت ۴۵، ۴۶:

أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ؕ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ
سَاكِنًا ؕ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا (۴۵) ثُمَّ قَبَضْنَا
إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا (۴۶)

ترجمہ: بل کہ تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کر (کے پھیلا) دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا۔ پھر سورج کو اس کا راہ نما بنا دیتا ہے۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ

اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ (۲۵-۴۵، ۴۶)

اختلافِ لیل و نہار

سورہ یونس۔ آیت ۶:

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ (۶)

ترجمہ: رات اور دن کے (ایک دوسرے کے پیچھے) آنے جانے میں اور جو چیزیں خدا نے آسمان اور زمین میں پیدا کی ہیں (سب میں) ڈرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (۱۰-۶)

رنگ اور زبان کا فرق

سورہ روم۔ آیت ۲۲:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ السِّنِّتِكُمْ وَالْوَانِكُمْ^ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ (۲۲)

ترجمہ: اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا، اہل دانش کے لیے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ (۳۰-۲۲)

ایام کی گردش

..... سورہ آل عمران۔ آیت ۱۴۰:

إِنَّ يَسُسُّكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلَهُ^ط وَتِلْكَ
الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ^ع وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ^ط وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰)

ترجمہ: اگر تمہیں شکست کا زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ (۳-۱۴۰)

انگریزی متن میں یہاں حوالہ میں ایک بے قاعدگی ہے پہلے حوالہ نمبر ۱۰ (ص ۱۰۲) دیا گیا ہے اور حوالہ نمبر (۹) اسی صفحہ پر بعد میں دیا گیا ہے جو کہ ترتیب کے خلاف ہے اسی طرح حاشیے میں حاشیہ نمبر ۹ کے تحت آیات کے حوالے دیے گئے ہیں جب کہ حوالہ نمبر ۱۰ کے تحت بائیو گرافیکل ہسٹری آف فلاسفی کا حوالہ دیا گیا ہے دونوں حوالے بے موقع نظر آتے ہیں۔ تاہم حاشیے میں حوالہ نمبر ۹ کے تحت دی گئی آیات کا ترجمہ شامل کیا جاتا ہے :

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا
لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ
إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۳۷)

۱۔ اور رات دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بل کہ خدا ہی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم کو اس کی عبادت منظور ہے۔ (۳۷:۳۱)

أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ؕ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ
سَاكِنًا ؕ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا (۴۵) ؕ

۲۔ بل کہ تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کر (کے پھیلا) دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا پھر سورج کو اس کا راہ نما بنا دیتا۔ (۴۵:۲۵)

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ (۶)

۳۔ رات دن کے (ایک دوسرے کے پیچھے) آنے جانے میں جو چیزیں خدا نے آسمان اور زمین میں پیدا کی ہیں (سب میں) ڈرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں (۶:۱۰)

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ السِّنِّكُمْ وَ
الْوَانِكُمْ ؕ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ (۲۲)

۴۔ اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لیے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ (۲۲:۳۰)

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (۷۲)

۵۔ اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں سے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزرتے ہیں۔ (۷۲:۲۵)

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَكْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۷۲)

۶۔ اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور (نجات کے) رستے سے بہت دُور۔ (۷۲:۱۷)

(آخری دو آیات کا موضوع الگ ہے اور آگے بیان ہوا ہے جس کے حوالے کے لیے تشکیل میں انھی سے حوالہ پیش کیا گیا ہے)

عالم میں بہرہ اور اندھا بن کر نہ رہیں

”حاصل کلام یہ ہے کہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں ادراک ہوتا ہے، حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و فکر سے کام لے، یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح اعراض کرے کیوں کہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا رہے گا۔“ (تشکیل جدید، ص ۱۹۶)

حوالہ آیت سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۲:

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَكْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۷۲)

ترجمہ: اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور

نجات سے بہت دُور۔ (۷۲-۱۷)

تفسیر: اور جو شخص دنیا کی ان نعمتوں کی شکر کی بجائے آوری سے اندھا رہے گا وہ جنت کی نعمتوں سے بھی اندھا رہے گا اور زیادہ گمراہ ہوگا یا یہ کہ جو شخص اس دنیا میں راہِ نجات اور حجت و بیان دیکھنے سے اندھا رہے گا تو وہ آخرت میں حجت اور منزلِ نجات دیکھنے سے بہت اندھا رہے گا اور زیادہ گمراہ ہوگا۔ (تفسیر ابن عباس، جلد دوم، ص ۱۹۵)

انبیاء کی تکذیب موجب عذاب

امام موصوف (غزالی) نے قرآنی دلائل کو بھی ارسطاطالیسی اشکال ہی کے رنگ میں پیش کیا ہے، حالاں کہ سورہ الشعرا میں اس دعویٰ کا اثبات کہ انبیاء کی تکذیب سے عذاب لازم آتا ہے تاریخی نظائر کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ (تشکیلِ جدید، ص ۱۹۸)

حوالہ آیت سورہ الشعرا آیت ۱۳۹:

وَمَا نَحْنُ بِبُعْذِبِينَ (۱۳۸) ۹ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ ۱۰ إِنَّ
فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۱۱ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۹)

ترجمہ: اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا تو انہوں نے ہود کو جھٹلایا، سو ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا، بے شک اس میں نشانی ہے اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ (۱۳۹-۲۶)

علم کی ابتدا محسوس سے

علامہ اقبال نے اسلامی ثقافت کی بحث میں یہاں یونانی علوم کے مسلمانوں پر اثرات کو موضوع بنایا ہے، علامہ کے نزدیک قرآن مجید کی روح حقیقت میں فلسفہ یونان کے خلاف ہے، ابتدا میں مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں ہوا اور انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فلسفہ یونان کی روشنی میں کیا۔ لیکن جلد ہی مسلمانوں کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور پھر اس کے بعد اسلامی تہذیب کی حقیقی روح برسر کار آئی اور اس منہاج کی ابتدا ہوئی جس کا تعلق مشاہدے اور

تجربے سے ہے۔ علامہ کے نزدیک تجربی منہاج کے حقیقی بانی مسلمان ہیں اس سلسلے میں رابرٹ بریفالٹ کی کتاب تشکیل انسانیت سے ایک طویل اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اور تجربی منہاج یونانی حکمت سے مفاہمت کی بنا پر نہیں بل کہ تصادم اور کشاکش کی بنا پر ظہور پذیر ہوا۔ علامہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے مزید دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”لہذا پہلی بات جو اس بحث میں کہ اسلامی ثقافت کی حقیقی روح کیا ہے ہمارے سامنے آتی ہے، محسوس اور متناہی پر اس کی وہ توجہ ہے جو اس نے علم و حکمت کی جستجو میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں منہاج تجربی وضع ہوا تو حکمت یونان سے کسی مفاہمت کی بنا پر نہیں، بل کہ اس سے مسلسل ذہنی تصادم اور کشاکش کے بعد۔ بریفولٹ کہتا ہے کہ یونانیوں کو درحقیقت نظریوں سے دل چسپی تھی، حقائق سے نہیں تھی، لہذا ان کے افکار ایک طرح کی روک تھے جس نے مسلمانوں کو کوئی دوسو برس تک سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ قرآن کی حقیقی روح کیا ہے۔ ان افکار نے تو عربوں کے عملی ملکات بھی دبائے رکھے۔ لہذا ہم چاہتے ہیں اس غلط فہمی کا ہمیشہ کے لیے ازالہ کر دیں کہ یہ یونانی فلسفہ تھا جس نے اسلامی تہذیب و ثقافت کی ہیبت اور وضع قطع متعین کی۔ اس سلسلے میں ہمارے جو دلائل ہیں ان کا ایک حصہ ہم پہلے پیش کر آئے ہیں، دوسرا اب پیش کر رہے ہیں۔“ (تشکیل جدید، ص

(۲۰۲-۲۰۳)

علم کی ابتدا محسوس سے ہوتی ہے، کیوں کہ جب تک ہمارا ذہن اسے اپنی گرفت اور قابو میں نہیں لے آتا، فکر انسانی میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ اس سے آگے بڑھ سکے۔ (تشکیل جدید، ص ۲۰۲) حوالہ آیت سورہ الرحمان :

يَسْعُرُ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَاَنْفُذُوا ۗ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا
بِسُلْطَنِ (۳۳) ؕ

ترجمہ: اے گروہ جن وانس اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان وزمین کے کناروں سے نکل جاؤ اور زور کے سوا تم نکل سکنے کے ہی نہیں۔ (۳۳-۵۵)

تفسیر: یعنی اللہ کی حکومت سے کوئی چاہے کہ نکل بھاگے تو بدوں قوت و غلبہ کے کیسے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ کیا خدا سے زیادہ کوئی قوی اور زور آور ہے پھر نکل کر جائے گا کہاں، دوسری قلم رو کون سی ہے جہاں پناہ لے گا۔ نیز دنیا کی معمولی حکومتیں بدون سند اور پروانہ راہداری کے اپنی قلمرو سے نکلنے نہیں دیتیں تو اللہ بدون سند کیوں نکلنے دے گا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۷۰۷)

مسئلہ زمان کی بحث

” پھر اگر زمانہ بھی ایک سلسلہ ہے باہم دگر منفردانات کا تو اس میں کوئی معنی پیدا نہیں ہوں گے، نہ ہی وہ کائنات پر اثر انداز ہو سکے گا۔ مگر یہ کائنات کا وہ تصور ہے جس سے ذہن انسانی حیران و سرگرداں رہ جاتا ہے۔ ہم اس خیال سے کہ ہمارے مرئی زمان و مکاں کی ایک حد بھی ہے مبہوت رہ جاتے ہیں ہم سمجھتے ہیں متناہی گویا ایک سد ہے جس نے ذہن انسانی کی حرکت کو روک رکھا ہے اور جس کی حدود سے آگے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہمارا ذہن زمان متسلسل اور مکانی خلائی محض پر غالب آ جائے قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۲۰۳)

حوالہ آیت سورہ وانجم آیت ۴۲ :

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (۴۲)

ترجمہ: اور یہ کہ تمہارا پروردگار کے پاس ہی پہنچنا ہے۔ (۴۲-۵۳)

”اس آیت پر غور کیا جائے تو قرآن پاک کے ایک نہایت گہرے تصور کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ یوں ہمیں بہ وضاحت سمجھا دیا گیا ہے کہ اگر ہمیں اپنے منتہا کی تلاش ہے تو ہمارا ستاروں کی طرف بڑھنا عبث ہو گا ہم اس کا تلاش کرنا چاہتے ہیں تو لا متناہی حیات کوئی اور روحیت میں تلاش

کریں۔ (تشکیلِ جدید، ص ۲۰۳)

اسلامی فکر اور لامتناہی سے دل چسپی

”یونانیوں کی نظر ہمیشہ تناسب پر رہی لامتناہی سے انھیں دل چسپی نہیں تھی۔ ان کا ذہن ہمیشہ وجودِ متناہی کی قدرتی شکل و ہیئت اور اس کے قطعی اور معین حدود میں الجھا رہا۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فکر محض ہو یا نفسیات مذہب، یعنی تصوف کے مدارج عالیہ، دونوں کا نصب العین یہ رہا کہ لامتناہی سے لطف اندوز ہوں۔“

(تشکیلِ جدید، ص ۲۰۳)

اس کے بعد علامہ نے ایک بار پھر زمان و مکاں کی بحث چھیڑی ہے اور مختلف مسلمان فلاسفہ کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ اس میں علامہ عراقی اور خواجہ محمد پارسا کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے کچھ قرآنی آیات پیش کی ہیں۔

”عراقی کے نزدیک مکان کی موجودگی تو ذاتِ الہیہ کی نسبت سے بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ اس کا استدلال آیات ذیل سے کرتا ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۲۰۷)

حوالہ آیت۔ ۱۔ سورہ المجادلہ آیت۔ ۸ :

الْمُتَرَالِي الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لَهَا نُهُوا
عَنْهُ وَيَتَنَجَّوْنَ بِالْآثِمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ زِإِذَا
جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي
أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ط حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ
يُصَلُّونَهَا فَبئسَ البصيرُ (۸)

ترجمہ : کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا پھر جس کام سے منع کیا گیا تھا وہی پھر کرنے لگے اور یہ تو گناہ اور ظلم اور رسولِ خدا کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو جس کلمے سے خدا نے تم کو دعا نہیں دی اسی سے تمہیں دعا دیتے

ہیں اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اگر واقعی پیغمبر ہیں تو جو کچھ کہتے ہیں خدا ہمیں اس کی سزا کیوں نہیں دیتا۔ اے پیغمبران کے لیے دوزخ ہی کی سزا کافی ہے۔ یہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بڑی جگہ ہے۔ (۵۸-۸)

حوالہ ۲۔ سورہ یونس۔ آیت نمبر ۶۱ :

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۶۱)

ترجمہ : اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ خواہ کسی حال میں ہوں اور من جملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قرآن کریم کی سورت یا آیت پڑھتے ہوں اور اسی طرح اور لوگ بھی جو نیکیاں اور برائیاں کرتے ہیں ہمیں تمہاری سب حالتوں اور تمہاری تلاوت اور تمہارے سب کاموں کی خبر رہتی ہے۔ جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور قرآن کریم کی تکذیب میں لگتے ہو اور بندوں کے اعمال میں سے آپ کے رب کے علم سے کوئی چیز بھی ذرہ برابر غائب نہیں اور نہ کوئی چیز اس مقدار مذکور سے چھوٹی ہے اور نہ بڑی چیز اور بھاری مگر سب بوجہ احاطہ علم الہی کے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ (۱۰-۶۱)

حوالہ ۳۔ سورہ ق آیت نمبر ۱۶ :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۗ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۱۶)

ترجمہ : اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا اور جو خیالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (۵۰-۱۶)

تفسیر عثمانی: یعنی اس کے ہر قول و فعل سے ہم خبردار ہیں حتیٰ کہ وساوس و خطرات اس کے دل میں گزرتے ہیں ان کا بھی ہم کو علم ہے۔

گردن کی رگ مراد ہے جسے شہ رگ کہتے ہیں اور جس کے کٹنے سے انسان مر جاتا ہے۔ شاید یہ کنایہ ہو جان اور روح سے، مطلب یہ ہوا کہ ہم (باعتبار علم کے) اس روح اور نفس سے بھی نزدیک ہیں۔ یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس سے بھی زیادہ ہے نیز علت و منشا کو معلول اور ناشئ کے ساتھ وہ قرب حاصل ہے جو معلول اور ناشئ کو خود اپنے نفس سے بھی نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانی، ص ۶۸۹)

”یاد رکھنا چاہیے، قرب و اتصال اور باہد گرفتار اق وہ الفاظ ہیں جن کا اطلاق جس طرح مادی اجسام پر کیا جاتا ہے ذات الہیہ پر نہیں کیا جاسکتا، حیات الہیہ کا تعلق ساری کائنات سے ہے۔ بعینہ جیسے روح کا بدن سے روح بدن کے اندر ہوتی ہے نہ باہر نہ اس سے متصل نی منفصل با ایں ہمہ اس کا اتصال بدن کے پر ذرے سے قائم ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۲۰۸)

تاریخِ ایام اللہ

”بہر حال اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں دیکھیے کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابن مسکویہ کے اس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے، مزید تقویت پہنچتی ہے علی ہذا ابن خلدون کے نظریہ تاریخ سے۔ قرآن پاک نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۲۱۲) حوالہ آیت۔ سورہ ابراہیم آیت ۵

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَذَكَّرَهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۵)

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جا اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ اس میں ان لوگوں

کے لیے جو صابر و شاکر ہیں خدا کی نشانیاں ہیں۔ (۵:۱۴)

تفسیر: ایام کا لفظ عربی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لیے بولا جاتا ہے، ایام اللہ سے مراد تاریخ انسانی کے وہ ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ زمانہ کی قوموں اور بڑی شخصیتوں کو ان کے اعمال کے لحاظ سے جزایا سزا دی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ ص ۴۷۱-۴۷۲)

اس حوالہ سے سے ایم سعید شیخ نے متعدد آیات کا حوالہ دیا ہے۔

الْمَ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِمَّنْ قَرْنٌ مَّكَّنْتُمْ فِي
الْأَرْضِ مَا لَمْ نُنَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِطْرًا
صَوًّا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِيًا مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ
بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ (۶)

ترجمہ: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتوں کو ہلاک کر دیا۔ جن کے پاؤں ملک میں ایسے جمادئے تھے کہ تمہارے پاؤں بھی ایسے نہیں جمائے اور ان پر آسمان سے لگاتار مینہ برسایا اور نہریں بنا دیں جو ان کے (مکانوں کے) کے نیچے بہ رہی تھیں پھر ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور ان کے بعد اور امتیں پیدا کر دیں۔ (۶:۶)

اقوام و امم کا محاسبہ

”اس (قرآن مجید) کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و امم کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ انہیں اپنی بد اعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار تاریخ سے استناد کیا ہے، علاوہ ازیں قارئین کی توجہ دلائی کہ نوع انسانی کے گزشتہ اور موجودہ احوال و مشنوں کے مطالعے میں غور و فکر سے کام لیں۔“
(تشکیل جدید، ص ۲۱۲)

اس حوالے سے علامہ نے قرآن پاک کی تین سورتوں سے آیات پیش کی ہیں۔

۱۔ سورہ براہیم۔ آیت ۵

۲۔ سورہ الاعراف۔ آیت ۱۸۱-۱۸۲

۳۔ سورہ آل عمران۔ ۱۳۷۔ (۱۳۶ درست نہیں)

۴۔ سورہ آل عمران۔ ۱۴۰ (۱۳۹ درست نہیں)

۵۔ سورہ الاعراف۔ ۳۴

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَذَكَّرَهُمْ بِآيَةِ اللَّهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۵)

ترجمہ: بالترتیب اور ہم نے موسیٰؑ کو نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جا اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو صابر و شاکر ہیں خدا کی نشانیاں ہیں۔ (۱۴-۵)

وَمِن مَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۱۸۱) ۴
وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۱۸۲)

۲۔ اور ہماری مخلوقات میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم بھی ہوگا۔

(۱۸۲-۱۸۱-۷)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۗ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۳۷)

۳۔ تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ (۱۳۷-۳)

إِنَّ يَسُسُّكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلَهُ ۗ وَتِلْكَ

الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰) ۝

۴۔ اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے
اور یہ وہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس سے بھی
مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو متمیز کر دے اور تم میں سے گواہ بنائے اور خدا
بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۴۰-۳)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَ
لَا يَسْتَقْدِمُونَ (۳۴)

۵۔ اور ہر ایک فرقی کے لیے (موت کا) ایک وقت مقرر ہے، جب وہ
آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی۔ (۳۴-۷)

”آخری آیت پر نظر رکھیے تو اس کی حیثیت ایک مخصوص تاریخی تقسیم کی ہے
جس میں گویا بڑے حکیمانہ انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ امم انسانی کا مطالعہ
ہمیں بطور اجسام نامیہ علمی نہج پر کرنا چاہیے۔ لہذا اس سے بڑی غلط فہمی
اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ایسا خیال موجود نہیں جو فلسفہ تاریخ
کا سرچشمہ بن سکے۔ حالاں کہ بہ نگاہ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا
مقدمہ سرتاسر اس روح سے معمور ہے جو قرآن مجید کی بدولت پیدا ہوئی۔
وہ اقوام و امم کے عادات و خصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں زیادہ تر قرآن
پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے بہ حیثیت ایک قوم عربوں
کی سیرت و کردار کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے قرآن پاک ہی کی اس آیت کی
تفصیل مزید ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۲۱۳)

حوالہ آیت سورہ توبہ نمبر ۹۷-۹۸ :

اقوام و امم کی عادات و خصائل

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ

مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۹۷) وَ
 مِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمْ
 الدُّوَابَّ ۗ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ
 عَلِيمٌ (۹۸)

ترجمہ: دیہاتی لوگ سخت کافر اور منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام
 (شریعت) خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی)
 نہ ہوں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو اسے تاوان سمجھتے ہیں اور
 تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انھی پر بُری مصیبت (واقع) ہو
 اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (۹: ۹۷، ۹۸)

تفسیر: یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے احوال بیان ہوئے تھے۔
 اب کچھ حال دیہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں، کفار،
 منافقین اور مخلص مسلمان، چوں کہ دیہاتی لوگ قدرتی طور پر عموماً تند خو اور سخت مزاج ہوتے
 ہیں اور مجالس علم و حکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب و شائستگی کا اثر اور علم و عرفان کی روشنی
 بہت کم قبول کرتے ہیں اس لیے ان کا کفر و نفاق شہری منافقین سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ان کو
 ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم و صلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت اور تہذیب کے وہ
 قانون اور قاعدے معلوم کریں جو خدا تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر نازل کیے۔ علم و معرفت ہی
 وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی اور مہذب بناتی ہے۔

اعراب منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستہ میں کچھ خرچ
 کرنا پڑ جاتا ہے تو ایسی کراہت سے خرچ کرتے ہیں گویا کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو۔

تاریخی تنقید کا اصول

”واقعات کی صحت کا انحصار آخر الامر اس بات پر ہے کہ ان کے راوی کون

ہیں تاریخ تنقید کا اصول اولین یہ ہوگا کہ ہم ان کی سیرت اور کردار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکیں۔ بغیر اس کے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انہوں نے جس امر کی شہادت دی ٹھیک تھا یا غلط۔ لہذا قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۲۱۳)

حوالہ آیت سورہ الحجرات آیت - ۶ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن
تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصِحُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ
ذَمِيمِينَ (۶)

ترجمہ: مومنو! اگر کوئی بد کردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی میں نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔ (۶-۴۹)

تفسیر: اکثر نزاعات اور مناقشات کی ابتدا جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لیے اول اختلاف و تفریق کے اسی سرچشمے کو بند کرنے کی تعلیم دی، یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرو، فرض کیجیے ایک بے راہ رو اور تکلیف دہ آدمی نے اپنے دل کے کسی خیال اور تجربے سے بے قابو ہو کر کسی قوم کی شکایت کی، تم محض اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس قوم پر چڑھ دوڑے۔ بعدہ ظاہر ہوا کہ اس شخص نے غلط کہا تھا تو خیال کرو اس وقت کس قدر پچھتانا پڑے گا اور اپنی جلد بازی پر کیا کچھ ندامت ہوگی اور اس کا نتیجہ جماعت کے حق میں کیسا خراب ہوگا۔ (تفسیر عثمانی - ص ۶۸۵)

”آگے چل کر اسی اصول سے جو اس آیت میں پیش کیا گیا اور جس کا اطلاق جب راویان حدیث پر ہوا تو رفتہ رفتہ تاریخی تنقید کے قوانین مرتب ہوتے چلے گئے۔ عالم اسلام میں جس تاریخ کی پرورش جس طرح ہوئی وہ بجائے خود ایک بڑا دل چسپ موضوع ہے۔ یہ قرآن پاک کا بار بار حقائق پر زور دینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھر اس امر کی ضرورت کہ آں حضرت کے

ارشادات صحت کے ساتھ متعین ہوں، علیٰ ہذا مسلمانوں کی یہ آرزو کہ اس طرح ان کی آئندہ نسلوں کو اکتسابِ فیض کے دوامی سرچشمے مل جائیں، یہ عوامل تھے جن کے زیر اثر ابن اسحاق، طبری اور مسعودی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ (تشکیلِ جدید، ص ۲۱۴)

وحدت مبداء حیات

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۗ وَ
اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ
عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (۱)

ترجمہ: لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اس نے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور قطع مودتِ ارحام سے بچو، کچھ شک نہیں خدا دیکھ رہا ہے۔ (۱:۴)

یہ ہے قرآن مجید کا ارشاد۔ مگر پھر یہ امر کہ زندگی کا ادراک بہ طور وحدت نامیہ کے ہو جائے، کچھ دیر ہی کے بعد ہوتا ہے۔ یوں بھی اس تصور کی نشوونما اس امر پر موقوف ہے کہ اقوام و امم احوال عالم کی اصل رو میں داخل ہو جائیں۔ اسلامی فتوحات کی رفتار چوں کہ بڑی تیز تھی اس لیے مسلمانوں کو یہ موقع جلد ہی میسر آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں اسلام سے پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا، لیکن یہ امر کہ نوع انسانی ایک جسم نامی ہے مسیحی روم کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ (تشکیلِ جدید، ۲۱۵)

ابن خلدون اور تصور زمان

”اگرچہ ابن خلدون کو مابعد الطبیعات سے مطلق دل چسپی نہیں تھی، بل کہ وہ

درحقیقت اس کا مخالف تھا، بایں ہمہ اس نے زمانے کا تصور جس رنگ میں کیا تھا، ہم اس کے پیش نظر اس کا شمار برگساں کے پیش رووں میں کریں گے اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ، اختلاف لیل و نہار، کو حقیقت مطلقہ کی جس، ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، ایک آیت تصور کرنا چاہیے۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۲۱۷)

حوالہ آیت سورہ الرحمن۔ آیت ۲۹ :

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي
شأن (۲۹) ء

ترجمہ: آسمان و زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ (۲۹-۵۵)



الاجتہاد فی الاسلام

Principle of Movement in Structure of Islam the Principle

دراصل اقبال کے اس مقالے کے انگریزی عنوان کا لفظی ترجمہ اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول ہے، یعنی اجتہاد کے روایتی فقہی معنوں سے ہٹ کر اس کی تعبیر ایک اصول حرکت کے طور پر کر رہے ہیں، مقالہ کی ابتدا بھی اسی نقطہ نگاہ سے کرتے ہیں کہ تحریک اسلام نے کائنات کو متحرک قرار دیا اور تاریخ انسانی کے ایسے مرحلے پر نمودار ہوئی جب رنگ و خون کے زمین پیوستگی کے رشتے توڑ کر اتحاد انسانی کے لیے اساس فرام کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسے قریب المرگ تمدن، جس کی بنیاد شاہت پر قائم تھی کی جگہ لینے کے لیے دنیا کو ایک نئی تہذیب کی حاجت تھی۔

اقبال واضح کرتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا مگر جب سے فقہ کے چار مکاتب فکر قائم ہوئے ہیں انہوں نے عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی، کیوں کہ انہوں نے اجتہاد پر ایسی کڑی شرطیں لگا دی ہیں جن کا پورا کرنا محال ہے اقبال کے نزدیک سیاسی زوال اور انحطاط کے دور میں ایسا کرنا اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو محفوظ کرنے کے لیے ضروری تھا، لیکن وہ قدامت پسند علما کے رویے پر احتجاج بھی کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک قوموں تقدیر اور زندگی کا دار و مدار اس پر نہیں کہ وہ کہاں تک منظم ہیں بل کہ اس پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، گزشتہ تاریخ کے بے جا احترام کے بجائے ایسے افراد کی پرورش ہونی چاہیے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں، زیادہ تنظیم

کارحجان اسلام کی روح کے منافی ہے، اسلام کی نشاۃ الثانیہ ضروری ہے۔ بد قسمتی سے قدامت پسند تنقیدی رویہ اختیار کرنے پر خفا ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ اسلاف کی راہنمائی میں اپنے مسائل آپ حل کریں۔

اقبالِ اجتہاد کے ذریعے فقہ اسلامی کی تشکیل نو پر اس لیے زور دے رہے ہیں کہ ایک طرف مغرب اور دوسری طرف اشتراکیت کی یلغار کا خطرہ تھا، ان کے نزدیک اجتہاد کا حق بہ حیثیت افرادِ علما کو نہیں دینا چاہیے بل کہ مجالس آئین ساز کو سونپنا چاہیے۔ دورِ حاضر میں فقہ اسلامی کے ماخذِ اجماع کا اسی صورت میں احیا ممکن ہے۔

اس مقالے میں اقبالِ اسلامی ریاست سے متعلق اپنا تصور بھی پیش کرتے ہیں ان کے نزدیک جمہوری طرزِ حکومت کا اصول اسلام کی روح کے عین مطابق ہے وہ ترکوں کے اس اجتہاد کو درست سمجھتے ہیں کہ خلیفہ یا امام کا منصب فردِ واحد کے بجائے ایک جماعت یا منتخب شدہ مجلس کے ذمہ بھی کیا جاسکتا ہے، خلافت یا امامت کا تصور تب قابلِ عمل تھا جب اسلامی سلطنت ایک تھی مختلف ریاستوں کی صورت میں ناقابلِ عمل ہے بل کہ ان کے اتحاد میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک فقہ اسلامی کے ماخذوں میں اجماع کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، اموی اور عباسی خلیفہ اجتہاد کا حق کسی مجلس کے بجائے افراد کے پاس رکھنے میں ہی اپنا فائدہ دیکھتے تھے کہ ان پر دباؤ ڈالا جاسکے ان کے نزدیک موجودہ زمانے میں یہ حق مجلسِ قانون سازی کی صورت میں ہونا چاہیے البتہ وہ موجودہ طرز کی مجلسِ قانون سازی کی اہلیت کے پیش نظر اس بات کی گنجائش ہونی چاہیے کہ دینی امور کے لیے علما کی ایک الگ مجلس قائم ہو جو قانون سازی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ علما اس مجلس کی راہنمائی کریں اور شریعت کی غلط تعبیرات کا سدباب کریں۔ (ملخص از۔ زندہ رود۔ جسٹس جاوید اقبال)

زندگی کا مبداءِ اصلی روحانی ہے

”اس نے (اسلام نے) رنگ و خون کے رشتے ٹھکرا دیے اور اپنی توجہ صرف فرد کی ذاتی قدر و قیمت پر رکھی۔ رنگ و خون کا رشتہ زمین پیوستگی کا رشتہ ہے

یہی وجہ ہے کہ اتحاد انسانی کے لیے کسی خالص نفسیاتی اساس کی جستجو جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ نوع انسانی ایک ہے اور اس کا مبداء اصلاً روحانی۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۲۲۳)

۱۔ اتحاد انسانی کے حوالے سے تشکیل میں سورہ البقرہ کی آیت ۲۱۳ کا حوالہ حاشیے میں دیا گیا ہے :

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ
مُنذِرِينَ ۗ وَانزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكَمَ بَيْنَ
النَّاسِ فِيهَا ۖ اختلفوا فيه ۗ وَ مَا اختلف فيه إلا الذين
أوتوه من بعد ما جاءتهم البينات بغيا بينهم ۗ فهدى
الله الذين آمنوا لينا اختلفوا فيه من الحق بإذنه ۗ وَ
الله يهدي من يشاء إلى صراطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲۱۳)

ترجمہ: (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کا فیصلہ کر دے اور اس میں اختلاف بھی ان ہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آچکے تھے (اور اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا) تو جس امر میں حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی اور خدا جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ (۲۱۳:۲)

۳۔ جب کہ انگریزی متن کے حاشیے میں روحانی حیثیت کے حوالے سے آیات

دی گئی ہیں -

فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ

سُجِدَيْنِ (۲۹)

ترجمہ: جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کر لوں اور اس میں اپنی
(بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

(۲۹:۱۵)

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ
الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۹)

۲۔ پھر اس کو درست کیا پھر اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی اور

تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (مگر) کم شکر کرتے ہو۔ (۹:۳۲)

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوْحِي فَقَعُوا لَهُ

سُجِدَيْنِ (۷۲)

۳۔ جب اس کو کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے

سجدے میں گر پڑنا۔ (۷۲:۳۸)

توحید کے تقاضے

”یہ بھی ایک طبعی امر تھا کہ اسلام کا ظہور ایک ایسی سادہ مزاج قوم میں ہوتا جو
قدیم تہذیبوں کے اثرات سے یک سر پاک اور ایک ایسی سر زمین میں
آباد تھی جہاں تین براعظم آپس میں مل جاتے ہیں اس نئی تہذیب نے اتحاد
عالم کی بنا توحید پر رکھی۔ لہذا بطور اساس ریاست اسلام ہی وہ عملی ذریعہ
ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیات عقلی اور
جذبات میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت حاصل کر لے، کامیاب ہو سکتے ہیں۔
اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک و
سلاطین کی۔ پھر چونکہ ذات الہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی
کی، لہذا اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے اسلام کے نزدیک حیات
کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف اور تغیر میں

جلوہ گردیکھتے ہیں۔“ (تشکیل جدید۔ ص ۲۲۶، ۲۲۷)

اس عبارت کے حوالے سے تشکیل جدید کے حاشیے میں درج ذیل آیات کا حوالہ دیا

گیا ہے۔

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنبَا عَلٰى رَسُولِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ (۹۲)

ترجمہ: اور خدا کی فرماں برداری اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتے رہو اور ڈرتے رہو۔ اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔ (۹۲:۵) (تشکیل میں حوالہ ۹۳:۵ ہے جو درست نہیں۔)

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ۚ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۗ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اَقْرَبٌ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا ۗ وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳)

۲۔ اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے اُدب سے بات کرنا۔ (۲۳:۱۷)

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۗ فِطْرَتِ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۗ لَا تَبْدِيْلَ لِمَخْلُوْقِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰)

۳۔ تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے راستے پر) سیدھا منہ کیے چلے جاؤ (اور) خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا (اختیار کیے رہو)۔ خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۳۰:۳۰)

اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (۲) ط

۴۔ خدا (جو معبود برحق ہے) اس کے سوا کوئی عبادت لائق نہیں زندہ
ہمیشہ رہنے والا۔ (۲:۳)

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي
شَأْنِ (۲۹) ء

۵۔ آسمان اور زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں وہ ہر روز
کام میں مصروف رہتا ہے۔ (۲۹:۵۵)

اجتہاد کی قرآنی بنیاد

”لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا لیکن فقہ اسلامی کی
اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ
رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ اور جس کی بنا جیسا کہ میں سمجھتا ہوں
قرآن کی اس آیت۔۔۔ پر ہے۔ (تشکیل جدید، ص ۲۲۸)

حوالہ آیت۔ سورہ العنکبوت۔ آیہ ۶۹ :

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ
الْمُحْسِنِينَ (۶۹) ء

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے
دکھائیں گے اور خدا تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔ (۶۹:۲۹)

تفسیر: یعنی جو اپنے علم کے مطابق نیکیاں کرتا ہے تو ہم اس کو ان چیزوں کی بھی
توفیق عطا فرمائیں گے جو اس کے علم میں نہیں یا یہ کہ ہم خوشی و حلاوت طبع اس کو نصیب فرمائیں
گے یا یہ کہ ہم اپنی اطاعت کی اس کو مزید توفیق عطا فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کی قول و
فعل توفیق و عصمت کے ذریعے مدد فرمائے۔ (تفسیر ابن عباس، جلد سوم، ص ۱۱)

نسلی امتیازات محض سہولت کے لیے

”میں تو کچھ یوں ہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید مسلمانوں

کو بتدرج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت، بل کہ ایک
انجمنِ اقوام ہے، جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو
تسلیم کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۲۴۶)

یہاں حاشیے میں قرآن پاک کی سورہ الحجرات کی آیت ۱۳ کا حوالہ دیا گیا ہے :
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ
ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۱۳)

ترجمہ : لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری
قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) خدا کے
نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا
سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔ (۱۳:۴۹)

مسلمان ایک مثالی اُمت

”اسلام ایسے معاشرے میں تو پرانی تاسیسات پر نظر ثانی کا مسئلہ اور بھی نازک ہو
جاتا ہے لہذا اس کے مصلحین کی ذمہ داریاں بھی ایک بڑی سنگین شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسلام
کی حیثیت لاجغرافی ہے اور اس کا مقصد ہے ایک ایسا نمونہ پیش کرنا جو اتحاد انسانی کی اس
شکل کے لیے جو بالآخر ظہور میں آئے گی مختلف بل کہ یہ کہنا چاہیے باہدگر حریف نسلوں کو اول
دولت ایمان سے مالا مال کرے اور پھر اس متفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی اُمت کی شکل
دے جس کا اپنا شعور ذات ہو۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۲۵۸)

اس عبارت کے حاشیے میں سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ دی گئی ہے،

(تشکیلِ جدید میں حوالہ نمبر ۱۴۲ لکھا ہے جب کہ یہ ۱۴۳ ہے)

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط وَ مَا جَعَلْنَا
الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ

يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ۗ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ
 هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِبْنَانَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ
 بِالنَّاسِ لَرءُوفٌ رَحِيمٌ (۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ
 بنو اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں اور جس قبلے پر
 تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون (ہمارے)
 گراں معلوم کریں کہ کون (ہمارے) پیغمبر کا تابع رہتا اور یہ بات
 (تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی (وہ
 گراں نہیں سمجھتے) اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی کھودے۔ خدا تو
 لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحبِ رحمت ہے۔ (۱۴۳:۲)

اسلام کے عائلی قوانین

”رہا ترکی شاعر کا مطالبہ (مساوات مرد و زن کے پیش نظر وراثت میں
 برابری کا) سو میں سمجھتا ہوں وہ اسلام کے قانونِ عائلیہ سے بہت زیادہ
 واقف نہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن پاک نے وراثت کے بارے میں جو
 قاعدہ نافذ کیا ہے اس کی معاشی قدر و قیمت کیا ہے شریعتِ اسلامی میں نکاح
 کی حیثیت ایک عقدِ اجتماعی کی ہے۔“ (تشکیلِ جدید، ص ۲۶۱)

ایم سعید شیخ نے یہاں حاشیے میں سورہ النساء کی آیت ۲۱ کا حوالہ دیا ہے :

وَ كَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ
 مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (۲۱)

ترجمہ: اور تم دیا ہو مال کیوں واپس لے سکتے ہو جب کہ تم صحبت کر چکے ہو
 اور وہ تم سے عہد و اٹق بھی لے چکی ہے۔ (۲۱:۴)

مردوں کو عورتوں پر فضیلت

”اگر قانوناً ان کے حصوں میں مساوات قائم نہیں کی گئی تو اس سے یہ نہیں

سمجھنا چاہیے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اس لیے کہ یہ خیال قرآنی تعلیم کے منافی ہے۔“ (تشکیل جدید، ص ۲۶۲)

اس موقع پر سورہ البقرہ کی آیت ۲۲۸ کا حوالہ دیا گیا ہے :

وَالْمُطَلَّاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ أَنْ يَكْتُبْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ
يُؤْمِنْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي
ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۖ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ
بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ (۲۲۸)

ترجمہ : اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں اور اگر وہ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کو جائز نہیں کہ خدا نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا ہے اُسے چھپائیں۔ اور ان کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو (اس) مدت میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔ (۲۲۸:۲)

خیر امت

”یقین کیجیے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کی اخلاقی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ کوئی نہیں۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چوں کہ وحی و تنزیل پر ہے لہذا وہ اپنی ظاہری خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے ہمارے لیے زندگی کی روحانی اساس ایمان و یقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی بہ رضا و رغبت اپنی جان تک قربان کر دے گا۔“ (تشکیل جدید، ص ۲۷۶)



کیا مذہب کا امکان ہے؟

Is Religion Possible?

اس خطبہ میں علامہ اقبال نے مذہب اور سائنس کی جستجوؤں کا مقابلہ کیا ہے، مذہبی زندگی کے تین ادوار ہیں۔ ایمان، فکر اور معرفت ایمان کا دور، احکام کے بے چون و چرا اطاعت کا دور ہے، اس کے بعد فکر کا دور آتا ہے جب انسان عقلاً سمجھنا چاہتا ہے کہ احکام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس دور میں مذہب کو ایسی مابعد الطبیعیات کی تلاش ہوتی ہے جو اس کے لیے اساس کا کام دے، سب سے آخر میں معرفت کا دور ہے۔ جب انسان کی آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتصال قائم کر سکے۔

سائنس ایک ایسی سمت بڑھ رہی ہے کہ عقلاً بھی الہیات کا نظام تشکیل دینا مشکل نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود مغربی انسان اپنے تصورات کے اعتبار سے خود اپنی ذات سے اور سیاسی اعتبار سے افراد افراد سے متصادم ہیں۔ اس کی بنیاد مادیت ہے جس نے انسان کو مفلوج کر دیا ہے، دوسری طرف مشرقی انسان اپنی اندرونی شیرازہ بندی سے قاصر ہے جس کی وجہ سے وہ تاریخ کی مسلسل حرکت کے ساتھ چلنے سے قاصر ہے، مسلمان وطنیت کا سہارا لے رہے ہیں کہ یوں انھیں قوت اور طاقت کا نیا سہارا مل جائے گا۔ مسلمان بہ حیثیت مجموعی یقین کھو بیٹھا ہے کہ اس کی روحانی زندگی کا احیاء دراصل مذہب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ مذہب سے افکار و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اسی سے وہ زندگی، قوت اور طاقت کے دائمی سرچشمے تک پہنچ سکتا ہے۔ ملحدانہ اشتراکیت میں گو ایک نئے مذہب کا جوش و خروش ہے لیکن وہ اس چیز سے برسریکا رہے جو اس کے لیے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔

پس دنیائے جدید کی مایوسی اور دل گرفتگی کا مداوانہ تو تصوف ہے نہ علاقائی وطنیت اور نہ ملحدانہ اشتراکیت۔ عصر حاضر کا انسان اگر پھر سے وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھاسکے گا جو سائنس یا علوم جدیدہ کی ترقی نے اس کے کندھوں پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت، جب تک انسان کو اپنی ابتدا اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہو اور جس میں ہمہ گیر مقابلے اور مسابقت کی دوڑ نے ایک انتہائی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ (زندہ رود۔ جلد سوم۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال)

اس خطبے میں علامہ اقبال نے براہ راست کسی قرآنی آیت کا حوالہ نہیں دیا اور نہ مترجم نے حاشیے میں کسی آیت کا حوالہ دیا ہے۔

